ہم غریب کیوں ہیں؟
عزیز الدین احمد

ہم غریب کیوں ہیں؟

(پاکستان کی سامراجی لوٹ کا جائزہ)

عزیزالدین احمد

مکتبہ فکر و دانش
۱۔ رائل پارک، لاہور

ناشر	محمد الیاس
مطبع	نفیس پرنٹرز
بار دوئم	جنوری ۱۹۸۷ء
قیمت	[illegible] روپے

پیش لفظ

زیرِ نظر کتابچہ میں پاکستان کے عوام کی غربت کی مختلف وجوہات میں سے ایک اہم وجہ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے —— یعنی امریکی سامراج کی سربراہی میں سامراجی ملکوں کی جانب سے پاکستان کے وسائل کی لُوٹ کھسوٹ۔ وسیع پیمانے پر کیے جانے والی اس لُوٹ کھسوٹ کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے اور قارئین کے سامنے متعلقہ اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔ استحصال کے ان پہلوؤں کی تفصیلات پیش کرنے کا مقصد ان کی ہولناکی کو زیادہ بہتر طریقے سے محسوس کرانا ہے۔

"پاکستان میں غربت کے مظاہر" ان حقائق کو از سرِ نو سامنے لانے کے لیے لکھا گیا ہے، جنہیں خلیج سے حاصل ہونے والی آمدنیوں میں اضافے کے بعد شعوری طور پر نظروں سے اوجھل کرایا جا رہا ہے خاص طور پر پنجاب کے اندر سرکاری اداروں میں صورتِ حال کو جوں کا توں رکھنے کی حامی سیاسی جماعتوں اور ان کے حامی اخبارات کی جانب سے یہ خیال پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ پاکستان میں ہر جگہ روپے کی ریل پیل ہے اور ملک میں غربت ختم ہو چکی ہے۔ اس مقصد کے لیے کبھی دیہاڑی دار مزدوروں کی اُجرتوں میں اضافے کا ذکر کیا جاتا ہے کبھی بڑے شہروں میں خورد و نوش اور روزمرّہ

کے استعمال کی اشیاء کے کاروبار کی ترقی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور کبھی سامانِ تعیش کی فراوانی کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس تمام پراپیگنڈہ کے ذریعے یہ غلط تاثر عام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ پاکستان میں اس طرح کی تنگدستی موجود نہیں جس کا واویلا بائیں بازو کی پارٹیاں اکثر کرتی ہیں۔ "پاکستان میں غربت کے مظاہر" برسرِ اقتدار طبقات کی جانب سے کیے جانے والے اس پراپیگنڈہ کا ازالہ کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روپے کی اس تیزی سے ہونے والی گردش کے باوجود جو خلیج کی آمدنیوں نے وقتی طور پر پیدا کی ہے۔ پاکستان میں آبادی کا بڑا حصہ جس میں شہروں کے غریب لوگ دیہی آبادی اور بالخصوص مظلوم قومیتوں کے عوام شامل ہیں آج بھی انتہائی غربت کی زندگی — بلکہ انسانی سطح سے نیچے کی زندگی — گذارنے پر مجبور ہے۔

کتابچے کے دیگر ابواب ان جدید نوآبادیاتی بندھنوں پر روشنی ڈالتے ہیں جو اس غربت کا ایک اہم سبب ہے۔ ان میں سے سامراجی امداد اور اس کے ہماری معیشت پر اثرات بارے بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ کسی قدر سامراجی ملکوں کی تجارت کے استحصالی پہلو پر بھی لکھا گیا ہے تاہم کثیر القومی کمپنیوں کے پاکستان میں استحصالی کردار کے بارے میں ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ اس کے لیے جس مطالعہ اور ریسرچ کی ضرورت ہے وہ بھی باقی ہے۔

زیرِ نظر کتابچے کا ایک مضمون اس موضوع کی ابتدائی چھان بین کرتا ہے۔ تاہم اسے لکھتے وقت یہ بات مدِنظر رہی ہے کہ یہ موضوع اس قدر اہم اور توجہ طلب ہے کہ ایک مضمون سے اس کی تشنگی پوری نہیں ہو سکتی۔

عزیز الدین
جنوری ۱۹۸۷ء

فہرست

باب ۱

پاکستان میں غربت کے مظاہر

۱۹۸۵ء کے وسط میں روزنامہ جنگ لاہور میں چھپنے والی ایک خبر ملاحظہ ہو:

غربت اور بیماری سے تنگ آکر بیوی اور چار بیٹیوں کو ذبح کر دیا۔
"میں اپنی بیٹیوں کے مستقبل سے مایوس تھا اور مجھے اپنی زندگی کی کوئی خواہش نہیں" ملزم کا بیان۔
(وہاڑی پ پ ا) ایک ۲۴ سالہ نوجوان غلام رسول نے غربت اور بیماری سے تنگ آکر اپنی بیوی اور چار معصوم بیٹیوں کو چھری سے ذبح کر دیا اور بعد ازاں اپنی چھت پر چڑھ کر خود ہی شور مچا دیا کہ اس نے اپنے خاندان کو ختم کر دیا ہے۔ اس موقع پر اس کے ہاتھ میں خون آلود چھری بھی تھی۔ غلام رسول کی شادی آٹھ سال قبل اپنی خالہ زاد بہن حنیفہ سے ہوئی تھی جس کے بطن سے چار بیٹیاں پیدا ہوئیں جن کی عمریں بالترتیب ۶، ۵، ۳ اور ایک سال تھیں۔ ان کا تمام خاندان غربت، بیماری اور کس مپرسی کا شکار رہتا تھا جس سے تنگ آکر غلام رسول نے انہیں سوتے میں چھری کے پے در پے وار کر کے قتل کر دیا۔ ملزم کے شور مچانے پر اہل محلہ کو یقین نہ آیا۔ مگر جب وہ اس کے گھر میں داخل ہوئے تو اس کی بیوی اور چار معصوم بیٹیوں کی لاشیں باورچی خانہ کے قریب فرش پر خون میں لت پت پڑی تھیں۔ غلام رسول نے اپنی بیوی کو سوتے ہوئے

ہلاک کرنے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بھاگنے کی کوشش
کی مگر غلام رسول نے اسے دبوچ لیا اور زمین پر گرا کر چھری کے پے در پے
وار کرکے موت کی نیند سلا دیا۔ مقتولہ حاملہ بیان کی گئی ہے۔ ملزم نے
گرفتاری کے بعد بتایا ہے کہ وہ مسلسل غربت اور بیماری سے عاجز رہتا
تھا۔ اس کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنے خاندان کا بوجھ اٹھاتا۔ غلام رسول
نے مزید کہا کہ وہ اپنی بیٹیوں کے مستقبل سے بالکل مایوس تھا اس نے کہا کہ میں
خودکشی بھی کر سکتا تھا مگر اس صورت میں میری بیوی اور بیٹیوں کے مسائل اور
بڑھ جاتے لہذا میں نے ان کا قصہ پاک کر دیا ہے اور اب مجھے اپنی زندگی کی
بھی کوئی خواہش نہیں ہے۔ پولیس مزید تفتیش کر رہی ہے"!
مندرجہ بالا خبر ہمارے اخبارات میں اپنی نوعیت کی کوئی واحد یا انوکھی خبر
نہیں ہے۔ اور اس سے ملتی جلتی خبریں ہمارے اخبارات میں آئے دن چھپتی رہتی ہیں
کردار بدل جاتے ہیں کبھی باپ بچوں کو ان کی ماں سمیت موت کے گھاٹ اتار کر
غربت اور تنگدستی سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے تو کبھی کوئی ماں اپنے بچوں
سمیت کسی دریا یا نالہ میں چھلانگ لگا کر ان مسائل سے چھٹکارا حاصل کرتی ہے۔
پاکستان میں کس قدر غربت ہے اسکا اظہار کن شکلوں میں ہوتا ہے اور
اس کے ہمارے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں ان سوالات پر ہم کسی قدر
اختصار سے اظہار خیال کریں گے۔
پاکستان کی معیشت کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں صحیح اعداد و شمار
موجود نہیں، مختلف حکومتی ادارے جن کا کام یہ اعداد و شمار اکٹھے کرنا ہے انہیں
فراہم کرنے کی دشواریوں سے بچنے کی کوشش میں بے احتیاطی سے جو اعداد و شمار
جمع کرتے ہیں وہ اکثر و بیشتر درست نہیں ہوتے اعداد و شمار جمع کرنے میں
رائے عامہ کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور ایسے اعداد و شمار گھڑے جاتے ہیں
جو حکومت وقت کے لیے سیاسی طور پر مفید ثابت ہوں اس
زمرے میں پاکستان میں فی کس آمدنی سے متعلقہ اعداد و شمار نیز پاکستان میں بیکاری

سے متعلق اعداد وشمار بھی آتے ہیں پاکستان کی فی کس آمدنی کے بارے میں نیشنل بنک آف پاکستان نے ۱۹۸۵ء میں مندرجہ ذیل اعداد وشمار شائع کئے ہیں:

۱۹۷۸ء میں فی کس سالانہ آمدنی ۲,۲۳۹ روپے

۱۹۸۲ء میں فی کس سالانہ آمدنی ۳,۷۲۵ روپے

۱۹۸۳ء میں فی کس سالانہ آمدنی ۴,۱۷۲ روپے

مندرجہ بالا اعداد وشمار کے مطابق ۱۹۷۸ء میں ہر پاکستانی کے حصے میں ۱۸۷/- روپے ماہوار آتے تھے جبکہ پانچ سال بعد ۱۹۸۳ء میں اس کی آمدنی بڑھ کر تقریباً ۳۵۰/- روپے ماہوار ہو گئی تھی۔ فی کس آمدنی کا تصور جو بورژوا ماہرین معیشت پیش کرتے ہیں وہ بہت گمراہ کن ہے فی الحقیقت ایک عام آدمی کی آمدنی اس سے بہت کم ہوتی ہے جتنی کہ پیش کی جارہی ہوتی ہے۔ فی کس آمدنی کا تخمینہ اس طرح سے لگایا جاتا ہے کہ ملک میں پیدا ہونے والی تمام آمدنی کو جمع کر کے تمام آبادی پر تقسیم کر دیا جاتا ہے اور اس میں سے اوسط نکال لی جاتی ہے یا الفاظ دیگر پاکستان کی مختلف صنعتوں، فیکٹریوں، ملوں، دیہاتی علاقوں میں پیدا ہونے والی تمام فصلوں سے حاصل ہونے والی آمدنی نیز ان کے علاوہ مختلف ملازمتوں یا کاروبار سے حاصل ہونے والی آمدنیوں کو جمع کر دیا جاتا ہے اور اسے برابر تمام آبادی پر تقسیم کر دیا جاتا ہے اس کے نتیجہ میں ۱۹۷۸ء میں اوسط آمدنی فی کس ۱۸۷/- روپے ماہوار اور ۱۹۸۳ء میں ۳۵۰/- روپے ماہوار نکالی گئی ہے۔ اس طرح کے تخمینہ میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ تمام آمدنی سرمایہ دار اور مزدور، امیر اور غریب پر برابر تقسیم کر دی جاتی ہے۔ فی الحقیقت پاکستان میں آمدنی کا بہت بڑا حصہ سرمایہ داروں جاگیرداروں، اعلےٰ افسروں یا کاروباری لوگوں اور ٹھیکیداروں کے پاس چلا جاتا ہے جبکہ پاکستان کے مزدوروں کسانوں اور غریب لوگوں کے پاس اس آمدنی کا نصف سے بھی کم حصہ پہنچتا ہے۔ ۱۹۷۸ سے ۱۹۸۳ تک فی کس آمدنی میں جو تقریباً دوگنا اضافہ دکھایا گیا ہے۔ اسے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی ۱۹۸۳ء میں

پاکستان کے ہر شہری کو ۔/۳۵۰ روپے ماہوار کی بجائے اس رقم کا نصف حصہ یعنی پونے دوسو روپے بمشکل ملتے ہوں گے۔ یعنی پانچ افراد پر مشتمل ایک خاندان کو ۔/۸۷۵ روپے ماہوار۔ ہو سکتا ہے کہ اصل آمدنی اس سے بھی بہت کم ہو بلکہ پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں جہاں فوج اور دیگر سول ملازمتوں میں لوگوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ نیز جہاں فیکٹریاں اور ملیں بہت کم ہیں فی کس آمدنی اس سے بھی بہت تھوڑی ہو گی۔

۔/۱۷۵ روپے ماہوار میں ایک فرد یا ۔/۳۵۰ روپے ماہوار میں میاں بیوی پر مشتمل خاندان انتہائی غربت ہی میں زندگی گذار سکتا ہے۔ اس رقم میں مکان کا کرایہ، کپڑے، خوراک، بیماری پر خرچ، شادی بیاہ۔ اس طرح کے دیگر بے شمار اخراجات پورے کرنا ممکن نہیں اور انہیں پورا کرنے میں ناکام ہو جانے کی وجہ سے بعض اوقات انسان وہ غلام رسول بن جاتا ہے جس کا تذکرہ اوپر ہوا ہے۔

پاکستان میں نہ صرف یہ کہ آمدنی کم ہے بلکہ بیکاری بھی پھیلی ہوئی ہے اور یہ غربت میں اضافہ کا ایک اہم سبب ہے۔ پاکستان میں کل آبادی کے مقابلہ میں کام کرنے والوں کی تعداد مندرجہ ذیل ہے

۱۹۷۱ء
کل آبادی: ۶ کروڑ پچاس لاکھ
کل کارکن: ۱ کروڑ پچاسی لاکھ

۱۹۸۱ء
کل آبادی: ۸ کروڑ ۴۷ لاکھ
کل کارکن: ۲ کروڑ ۴۵ لاکھ

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ یعنی قریباً چار گنا حصہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو معاشی سرگرمی نہیں کرتے بلکہ معاشی سرگرمی کرنے والوں پر انحصار کرتے ہیں یہ تعداد بچوں، بوڑھوں اور گھریلو عورتوں کے علاوہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو روزگار حاصل کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ دنیا کے اکثر ملکوں میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں جبکہ پاکستان میں

ایسا نہیں ہے۔ یہاں پر مردوں کے لئے بھی روزگار میسر نہیں، عورتوں کا ایک بہت مختصر حصہ معاشی سرگرمی میں حصہ لیتا ہے۔ جس کا اندازہ ۱۹۸۲ء میں اکٹھے کئے گئے مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے:

سال	۱۹۸۲ء
کل کارکن	۳۔کروڑ، ۱۰ لاکھ
مرد	۲۔کروڑ، ۶۷ لاکھ
عورتیں	۴۲۔ لاکھ، ۸۰ ہزار
میزان	۳۔کروڑ، ۱۰ لاکھ

پاکستان میں غربت کا ایک سبب یہ ہے کہ پورے گھرانے میں اکثر اوقات صرف ایک مرد کام کرتا ہے۔ جبکہ عورتیں گھروں میں بند رہتی ہیں، شہروں میں جہاں عورتیں کام کرنے کی خواہشمند ہوتی ہیں انہیں کام میسر نہیں ہوتا۔

شہروں میں مزدور، کلرک، چھوٹی موٹی ریڑھی لگانے والے، پھیری والے اور بیکار لوگ غریبوں کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں۔ مزدور، کلرک، ریڑھی چھابڑی لگانے والے، رکشہ چلانے والے زیادہ تر مقروض رہتے ہیں تنخواہ کا کچھ حصہ مکان کے کرائے میں چلا جاتا ہے۔ باقی حصہ دکاندار کو قرض میں لیگئی روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کے عوض ادا کر دیا جاتا ہے۔ اور اگلا پورا مہینہ پھر قرض کے ذریعے بسر ہوتا ہے ان لوگوں کے پاس بیماری کی صورت میں ڈاکٹر کو ادا کرنے کے لئے فیس نہیں ہوتی کپڑے سردیوں میں لنڈا بازار سے خریدے جاتے ہیں اور بیاہ شادیوں کے اخراجات کیلئے مزید قرضہ لیا جاتا ہے۔

دیہی علاقوں میں مزارع، غریب کسان اور کھیت مزدور غریبوں کی صف میں شامل ہوتے ہیں ان کی قوت خرید شہر میں رہنے والے غریب آدمی کی قوت خرید سے بھی کم ہوتی ہے۔ یہ فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے بعد فارغ وقت میں نزدیکی قصبہ یا شہر میں روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

غربت اور رہائش کے مسائل

شہری آبادی کا غریب حصہ انتہائی پسماندہ اور صحت کے لئے
نقصان دہ ماحول میں زندگی گذارتا ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں ہمارے شہر بہت
پھیلے ہیں۔ ایک طرف انتہائی امیر آبادیاں وجود میں آئی ہیں جو پاکستان کی بجائے یورپ
اور امریکہ کے شہروں کی آبادیاں معلوم ہوتی ہیں۔ کراچی اور لاہور کی ان امیر آبادیوں
میں ہر طرح کی شہری آسائشیں میسر ہیں، پختہ کشادہ سڑکیں، بجلی، گیس، پینے کا صاف
پانی، صفائی اور نکاسیٔ آب کے لئے منصوبہ کے تحت سیوریج اور گٹر سسٹم ہی کئی کنال
پر مشتمل پختہ فراخ ہوادار اور روشن گھر، ہر گھر کے ساتھ بچوں کے کھیلنے اور موسم گرما میں
کرسیاں نکال کر بیٹھنے کے لئے لان اور پھر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پہ بڑی بڑی گراونڈیں
جہاں بعض اوقات کوئی کھیلنے والا بھی نہیں ہوتا کیونکہ ہر گھر کے اندر بچوں کے کھیلنے
کے لئے لان موجود ہوتے ہیں۔ یہیں پہ شہر کی دوسری طرف ایک اور شہر آباد ہے جہاں
وہ لوگ رہتے ہیں جنہوں نے گلبرگ، ماڈل ٹاؤن، گارڈن ٹاؤن، نیو گارڈن ٹاؤن، فیصل
ٹاؤن، ڈیفنس یا سوسائٹی اپنے ہاتھوں سے تعمیر کئے ہیں۔ یہاں بنیادیں، دیواریں
اور چھتیں بنائی ہیں لینٹر ڈالے ہیں، بجلی کی تاریں بچھائی ہیں غسلخانے اور گٹر تعمیر کئے
ہیں، تمام کمروں میں رنگ و روغن کیا ہے لیکن ان کے اپنے گھروں میں نہ سیوریج
کا نظام ہے نہ سڑکیں ہیں نہ بچوں کے کھیلنے کے لئے گراونڈ ہیں، نہ روشنی ہے، ہر
طرف بدبو اور گندگی کے ڈھیر ہیں روشنی پیدا کرنے والے خود اندھیرے مکانوں
میں رہنے پر مجبور کر دئیے گئے ہیں۔

لاہور میں اس وقت ڈیڑھ سو کے لگ بھگ کچی آبادیاں موجود ہیں ان کچی آبادیوں میں ایک گھر بالعموم ایک کمرے اور ایک چھوٹے سے صحن پر مشتمل ہوتا ہے۔ لاہور کے علاقہ گڑھی شاہو کی کچی آبادی میں واقع ہم ایک ایسے گھر کا نقشہ پیش کرتے ہیں جہاں ریلوے کا ایک مزدور صادق رہتا ہے۔ صادق دیواروں کو پینٹ کرنے کا ماہر بھی ہے۔ چنانچہ فارغ اوقات میں وہ اضافی آمدنی حاصل کرنے کے لئے یہی کام کرتا ہے شہر کی امیر آبادیوں کی کئی بڑی بڑی کوٹھیوں میں اس نے ڈرائنگ روم بیڈروم اور دوسرے کمرے نفاست کے ساتھ پینٹ کئے ہیں۔ اسے بہت اچھی طرح پتہ ہے کہ کس کمرے میں کونسا رنگ استعمال کرنا چاہیئے اور مختلف رنگوں کی آمیزش کس انداز سے ہونی چاہیے۔ اپنے کام میں وہ ایک فنکار ہے کچی آبادی میں اس کا اپنا گھر ایک کمرے اور ایک مختصر صحن پر مشتمل ہے۔ کمرے کی لمبائی دس فٹ اور چوڑائی دس فٹ ہے تاہم اس کی چھت کی اونچائی عام انسانی قد سے چھوٹی ہے اس کے پاس پیسے نہیں تھے کہ مزید اینٹیں خرید کر مناسب اونچائی کا کمرہ بنا سکتا۔ اس لئے کمرہ میں کھڑا ہونے سے سر چھت کو چھونے لگتا ہے اور کمرے میں داخل ہونے کے لئے دروازہ میں سے جھک کر گذرنا پڑتا ہے۔ اس کمرے میں جہاں وہ اپنے خاندان سمیت رہتا ہے نہ کوئی کھڑکی ہے نہ روشندان چنانچہ نہ یہاں ہوا آتی ہے اور نہ روشنی۔ موسم برسات میں زیادہ بارش کے نتیجہ میں پانی کمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ کمرہ چھوٹا ہے اس لئے ایک چارپائی کے اوپر دوسری اور دوسری پر تیسری چارپائی رکھ کر تنگ کمرے میں ایک سے زیادہ چارپائیاں بچھانے کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ صادق کے گھر میں نلکا نہیں ہے۔ اردگرد کے کئی دوسرے گھروں کے لوگوں کے ساتھ وہ ایک قریبی نلکے سے پانی بھر کر لاتا ہے۔ صحن کے ایک کونے میں ٹٹی ہے جس کے دروازہ پر بوری لٹکائی گئی ہے۔ ٹٹی سے ایک نالی کے ذریعے پانی بہہ کر باہر گلی کی نالی میں چلا جاتا ہے تاہم غلاظت اندر گڑھے ہی میں سڑتی رہتی ہے سینکڑوں کیڑے اس غلاظت سے پیدا ہوتے ہیں اور اسے کھاتے رہتے ہیں اور مکھیاں دن بھر کمرے اور صحن کے دوسرے کونے

میں دراصل کچن میں بھنبھناتی رہتی ہیں جہاں صادق کی پہلی بیوی کھانا پکاتی تھی اور
اب دوسری بیوی کھانا پکاتی ہے۔ پہلی بیوی شادی کے چند سال بعد ہی ٹی بی کا شکار
ہوکر مرگئی تھی۔

اس کچی آبادی میں بارہ سو کے قریب گھر ہیں اور اکثر مکانوں کا نقشہ اور
تفصیلات صادق کے گھر جیسی ہی ہیں۔ کچی آبادیوں میں اکثر گھر اسی طرح سے روشنی اور
ہوا سے محروم ہوتے ہیں یہ غلاظت سے آلودہ اور غیر صحت مند ہیں فی الحقیقت ساری کچی
آبادی ہی حفظان صحت کے اعتبار سے صفر ہے۔ آبادی کے بیچوں بیچ بدرو ہے
جس میں گلیوں میں سے نکلنے والی چھوٹی چھوٹی نالیاں آکر ملتی ہیں۔ یہاں پر مکھیاں
اور مچھر عام ہیں، پانی بہت کم ہے اس لئے گھر کی پوری طرح سے صفائی نہیں ہو سکتی
کچی آبادیاں صرف لاہور تک محدود نہیں بلکہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں کچی آبادیاں
خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق کراچی شہر میں ۳۶۲ کچی آبادیاں
ہیں (۱)۔

ان کچی آبادیوں کے علاوہ اور بھی مزدور بستیاں ہیں جن کے حالات کچی آبادیوں
سے ملتے جلتے ہیں۔ شہر کے پھیلاؤ کے نتیجہ میں جہاں ایک جانب امیر آبادیاں وجود میں
آئی ہیں وہاں دوسری جانب چھوٹے درمیانے طبقے کے لوگوں اور بعض مزدوروں نے
چھوٹے چھوٹے پلاٹ خرید کر آبادیاں تعمیر کی ہیں ان آبادیوں میں سیوریج کا نظام موجود
نہیں جا بجا غلاظت کے ڈھیر پڑے ہوتے ہیں جہاں مرغیاں چونچیں مار مار کر غلاظت
سے غذا حاصل کرتی ہیں۔ جوہڑ ہیں مکھیاں ہیں اور مچھر بافراط ہیں۔ رہائشی سہولتیں
یہاں بھی موجود نہیں

لاہور اور اسطرح کے پرانے شہر بیماریوں کا مرکز بن رہے ہیں۔ لاہور کے اندرونی علاقے میں جسے
اندرون شہر کہا جاتا ہے صدیوں پرانے مکان بوسیدہ ہو چکے ہیں تنگ و تاریک گلیاں
ہیں اور شہر کی غلاظت بیل گاڑیوں اور بعض علاقوں میں کارپوریشن کے گندگی
اٹھانے والے ٹرکوں پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جاتی ہے شہر

کے کھاتے پیتے لوگ اکثر و بیشتر شہر سے باہر نئی رہائشی کالونیوں میں منتقل ہو چکے ہیں چنانچہ مکانوں اور گلیوں کی صفائی کا نظام خراب سے خراب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔
پاکستان کے دیہی علاقوں میں رہائشی حالات فلموں کی رومانوی تصویر کشی سے بالکل مختلف ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دیہاتی عوام کی اکثریت انسانوں کی بجائے جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دی گئی ہے آبادی کا ایک حصہ ایسے مکانوں میں رہتا ہے جو اکثر اوقات ایک کچے کمرے پر مشتمل ہوتے ہیں یہ کمرہ نم آلود و تاریک اور ہوا سے محروم کمرہ ہوتا ہے یہیں پر کھانا پکایا جاتا ہے۔ یہیں بیٹھک ہے۔ یہی سونے کی جگہ ہے اور یہیں جانور بھی باندھ دئے جاتے ہیں۔ ٹٹی کرنے کے لئے کھیت میں جانا ہوتا ہے اور پانی بھرنے کے لئے کنویں پر۔
پاکستان کے کم ترقی یافتہ علاقوں میں زندگی بسر کرنا انتہائی دشوار کام ہے پنجاب پاکستان کا سب سے ترقی یافتہ صوبہ ہے یہاں تونسہ کا مشہور قصبہ واقع ہے جسکے دیہات میں پانی کی شدید قلت ہے۔ موسم گرما میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ہوئے ہر سال پیاس کی وجہ سے لوگ مرتے ہیں اور اخباروں میں خبریں بھی چھپتی ہیں۔ کئی جگہیں ایسی ہیں جہاں انسان اور کتا ایک ہی جوہڑ سے پانی پیتے ہیں۔
پاکستان میں رہائشی سہولتوں کے بارے میں مختلف بین الاقوامی اداروں نے جو اعداد و شمار اکٹھے کئے ہیں ان میں اس صورت حال کی ایک جھلک نظر آتی ہے دنیا کے دیگر ملکوں سے ان اعداد و شمار کا تقابل مفید ہوگا اس سلسلے میں چیدہ چیدہ اعداد و شمار ہم قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ اچھی رہائش کا تعین اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ کسی ملک میں آبادی کا رہائشی سہولتوں سے کیا تناسب ہے یعنی ایک شخص کو کتنی رہائشی جگہ میسر ہے آیا بجلی مہیا ہے یا نہیں نلکے کا پانی ملتا ہے یا نہیں، علیحدہ باورچی خانہ اور غسل خانہ ہے یا نہیں۔
فی کس پاکستان میں کتنی رہائش موجود ہے اور اس کا دوسرے ملکوں سے کیا مقابلہ ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار ملاحظہ کریں!!

فی کس میسر رہائشی کمروں کی تعداد

ملک	افراد فی کمرہ
پاکستان	۲٫۸ " " "
ایران	۲٫۳ " " "
امریکہ	۰٫۶ " "

مندرجہ بالا اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ امریکہ میں ایک کمرہ تقریباً آدھا انسان استعمال کرتا ہے (یعنی ہر امریکی شہری کو رہنے کے لئے تقریباً دو کمرے میسر ہیں) جبکہ ایران میں دو سے کچھ زیادہ لوگ ایک کمرے میں رہتے ہیں اور پاکستان میں تین کے قریب آدمی (۲٫۸) ایک کمرے میں رہنے کے لئے مجبور ہیں۔ رہائشی سہولتوں کے اس پہلو سے پاکستان کا شمار دنیا میں سب سے نیچے کے دس ملکوں میں ہوتا ہے۔

نلکے کے صاف پانی کے حصول کے سلسلے میں بھی پاکستان دنیا کے بدنصیب ملکوں میں سے ہے ۱۹۸۴ء میں چھپنے والی ایک کتاب جو عالمی ریکارڈ بیان کرتی ہے کے مطابق وہ گھر جن میں نلکے کا پانی میسر ہے ان کا تناسب مندرجہ ذیل ہے[۲]:

امریکہ ۲٫۵ فیصد گھروں میں نلکے کا پانی نہیں
پاکستان ۸۴٫۴ " " " " " "

بالفاظ دیگر پاکستان میں سو میں سے صرف ۱۲½ گھروں میں نلکے کا صاف پانی میسر ہے یہی حال بجلی کی فراہمی کا ہے پاکستان کئی پسماندہ ملکوں کو بھی اس سلسلہ میں پیچھے چھوڑ گیا ہے بجلی سے محروم گھرانوں کے اعتبار سے پاکستان دنیا میں تیرہویں نمبر پر آتا ہے اہم اعداد و شمار مندرجہ ذیل ہیں۔

ترکی ۲۴٫۶ فیصد گھر بجلی سے محروم ہیں۔
الجیریا ۹۴٫۶ " " " " " "

پاکستان ۸۲٫۲ فیصد گھر بجلی سے محروم ہیں۔
بالفاظ دیگر پاکستان میں صرف ۱۷٫۸ فیصد گھر بجلی کی روشنی سے منور ہیں ان میں سے کتنے فیصد گھر امیر ہونگے اور کتنے گھر غریبوں کے اس کا اندازہ قاری خود لگا سکتا ہے۔

علیحدہ باورچی خانے کا تصور پاکستان کے صرف ۲۱٫۶ فیصد گھروں میں موجود ہے جبکہ ۷۸٫۴ فیصد گھر ایسے ہیں جہاں پر اسی کمرے میں جہاں لوگ رہتے ہیں اور سوتے ہیں چولہا بھی موجود ہوتا ہے۔ علیحدہ باورچی خانے سے محروم ملکوں کی فہرست میں پاکستان تیسرے نمبر پر ہے (۴)
پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کی حالت زار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں صرف ۳۸ فیصد مکانوں کو پانی کا کنکشن میسر ہے اور صرف ۲۸ فیصد مکانوں کو سیوریج کے نظام سے ملایا گیا ہے (۵)۔
محرومیوں کے عالمی ریکارڈ قائم کرنے میں پاکستان بیت الخلا کے سلسلے میں بھی پیش پیش ہے یہاں پر ہم محرومیوں کے لحاظ سے دسویں نمبر پر آتے ہیں پاکستان میں ۶۵٫۸ فیصد مکان بیت الخلا یا ٹٹی کی سہولت سے محروم ہیں اور لوگ باہر کھیتوں میں یا سڑکوں کے کنارے رفع حاجت کرتے ہیں۔

غربت اور خوراک

پاکستان میں جہاں حقیقی فی کس آمدنی پونے دو سو روپے کے لگ بھگ بنتی ہو (حکومتی ذرائع کے مطابق ۲۵۰/- روپے ماہوار) وہاں لوگوں کو کیا خوراک میسر آتی ہو گی اسکا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہوں اور ان میں ہر سال اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہو۔ پنجاب کے شہروں میں آبادی کا اکثر حصہ جو مزدوروں نچلے ملازم

پیشہ افراد کلرکوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ناشتے کے طور پر چائے اور ڈبل روٹی کا ایک پراٹھا، چائے اور رس بسکٹ، رات کے بچے ہوئے سالن اور روٹی یا کلچے اور چھولے وغیرہ استعمال کرتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے طور پر مزدور اور محنت کش عام طور پر گھر سے لے جائی گئی سادہ یا چپڑی روٹی اور بازار سے خریدے گئے چھولے، دال یا سبزی کا استعمال کرتا ہے رات کو اکثر و بیشتر روٹی کے ساتھ سبزی یا دال استعمال کی جاتی ہے۔ کلرک اور چھوٹے کاروباری لوگ ہفتہ میں ایک آدھ دن گوشت بھی استعمال کرتے ہیں۔

دیہات میں خوراک کی صورت حال کوئی زیادہ بہتر نہیں اکثر و بیشتر دیہی علاقوں میں ناشتے کا تصور موجود نہیں صرف دو وقت کا کھانا کھایا جاتا ہے۔ جو روٹی، چھاچھ، اچار اور سبزی پر مشتمل ہوتا ہے۔ دیہات میں گوشت کا استعمال عید بقر عید یا شادی بیاہ اور اسی طرح کی دوسری رسومات پر ہی ہوتا ہے۔

شہروں میں کہیں کہیں غریب آبادی دہی کا استعمال بھی کرتی ہے۔ لیکن یہ بہت کم ہے پاکستان میں۔ لوگوں کی اکثریت مسلمان ہونے کے ناطے اپنے گوشت خور ہونے کا فخریہ اظہار کرتی ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ پاکستان گوشت کے استعمال میں بھی عالمی سطح پر محروموں کی صف میں شامل ہے یہ ان دس ملکوں میں سے ہے جہاں عوام کو دنیا میں سب سے کم گوشت میسر ہے گوشت کے استعمال کے سلسلہ میں عالمی سطح پر اعداد و شمار مندرجہ ذیل ہیں۔

نام ملک	سالانہ گوشت کا استعمال فی کس
امریکہ	۳۰۴ گرام (ایک کلو میں ہزار گرام ہوتے ہیں)
مغربی جرمنی	۲۲۰ "
سوویت یونین	۱۴۵ "
جاپان	۶۴ "

رہائشی سہولتوں اور غذائی کمی نے ملک پاکستان کی آبادی کی اکثریت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ پاکستان میں ٹی بی سے جواب دنیا میں ہر جگہ قابلِ علاج مرض سمجھا جاتا ہے ہر سال ایک لاکھ اموات ہوتی ہیں (۲)۔ یہی حال ملیریا کا ہے اور معدے کی بیماریاں بھی عام ہیں۔

پاکستان کی اکثر بیماریوں کو "غربت کی بیماریوں" کا نام دیا جاتا ہے بچوں کی اموات کے لحاظ سے پاکستان دنیا کے سرفہرست ملکوں میں سے ہے ۱۹۷۵ء میں چھپنے والی امریکن ایڈ کے ادارے کی کتاب "پاکستان اکنامک ڈویلپمنٹ ڈیٹا" (اسلام آباد) کے مطابق پاکستان کی ۶۰٪ سے زیادہ آبادی عدم غذائیت کا شکار ہے اس کتاب کے مطابق پاکستان میں پیدا ہونے والے ہر چار بچوں میں سے ایک بچہ پانچ سال کی عمر سے پہلے دم توڑ دیتا ہے۔ اقوام متحدہ کے اکٹھے کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کے بعض چیدہ ملکوں میں بچوں کی شرح اموات مندرجہ ذیل ہیں۔

سوویت یونین	۸٫۵	بچے فی ہزار
امریکہ	۱۳	" "
برطانیہ	۱۲٫۶	" "
مغربی جرمنی	۱۴٫۷	" "
پاکستان	۱۲۴	" "

ان اعداد و شمار کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں اگر ایک ہزار بچے پیدا ہوں تو ۱۲۴ مر جاتے ہیں دراصل بچوں کی اموات کا تعلق عدم غذائیت سے ہے یعنی معیاری غذا میسر نہ آنے سے بچے کا جسم بیماری کیخلاف مزاحمت کے قابل نہیں رہتا ارد گرد غیر صحت مند ماحول کی وجہ سے جلد بیماری قبول کر لیتا ہے اور والدین میں دوا دارو حاصل کرنے کی استطاعت نہ ہونے کی بنا پر یہ بچے چل بستے ہیں۔

بچے میں غذائیت کی کمی ماں کے پیٹ سے شروع ہو جاتی ہے۔ چونکہ

چین	۵۱ "
ایران	۴۷ "
پاکستان	۱۴ "
سری لنکا	۸ "
ہندوستان	۴ "

(حوالہ: "The New Book of World Rankings":
(G.T. Kurian; New York; 1984.

مندرجہ بالا فہرست کے مطابق پاکستان میں گوشت کا استعمال فی کس ۱۴ گرام ہے یعنی ایک دن میں ۷۱ افراد کو ایک کلو گوشت میسر ہوتا ہے (پرانے حساب کے مطابق فی کس سوا تولے سے بھی کم)۔

پاکستان میں اس وقت سرمایہ دار اور بڑے تاجر اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کے عالمی ریکارڈ قائم کر رہے ہیں۔ ملاوٹ دودھ سے شروع ہو کر چائے کی پتی، نمک، مرچ، ہلدی، مصالحہ جات اور بناسپتی گھی تک موجود ہے آٹے میں سے سوجی اور میدہ نکال لئے جاتے ہیں غرضیکہ اشیائے خوردنی میں ہر جگہ ملاوٹ کی جاتی ہے ان حالات میں پاکستان میں مزدور، محنت کش اور نچلے درمیانے طبقے کے شہری وہ سستی اشیائے خوردنی خریدنے پر مجبور ہوتے ہیں جو ملاوٹ سے بھرپور ہوتی ہیں ایک پاکستانی ماہر معیشت کے مطابق انسانی جسم کو کم از کم ۲۰۰۰ حرارے (کیلوریز) کی ضرورت ہوتی ہے پاکستانی دیہات میں ۵۲٪ آبادی حراروں کی اس مقدار کا صرف ۹۰٪ حاصل کر سکتی ہے جبکہ شہروں کی ۴۰٪ آبادی بمشکل ۹۰٪ کے قریب حرارے حاصل کر سکتی ہے[۲]

صحت پر غربت کے اثرات

پاکستان میں کم آمدنی، بیکاری، غیر صحت مند

ماں کو غربت کے ماحول میں رہنے کی بنا پر مناسب حراروں پر مشتمل غذا، گوشت، انڈے، دودھ وغیرہ میسر نہیں ہوتی اس لئے بچہ بھی ماں کے پیٹ میں عدم غذائیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم کی نشوونما ادھوری رہ جاتی ہے۔

بچہ جننے والی ماؤں کی اموات کی تعداد بھی پاکستان میں بہت زیادہ ہے۔ پاکستان میں اموات کی یہ شرح برطانیہ کے مقابلہ میں ۱۴ گنا سے زیادہ ہے برطانیہ میں ہزار میں سے ایک سے کم عورت زچگی کی وجہ سے مرتی ہے جبکہ پاکستان میں شرح اموات ۱۴ فی ہزار ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ پاکستان میں ہر سال ۵۲ ہزار عورتیں زچگی کے ایام کے دوران مر جاتی ہیں۔(۸)

ان اموات کی بنیادی وجہ ڈاکٹروں کے مطابق غربت ہے یعنی غذائیت کی کمی، ماحول میں موجود غلاظت اور غیر صحت مند ماحول۔ امریکی ایڈ کے محکمے کی جس کتاب کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے اس کے مطابق پاکستان میں چالیس لاکھ بچے اور عورتیں غذا کی کمی کا شکار ہیں جن میں حراروں کی کمی لحمیات، وٹامن اور منرلز کی کمی نیز خوراک سے متعلق نقصان دہ عادات شامل ہیں۔

ماں میں غذائیت کی کمی کی بنا پر ایک طرف تو پاکستان میں زچگی کے دوران اموات کی شرح بہت زیادہ ہے تو دوسری جانب پیدا ہونے والے بچے کمزور اور لاغر ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں ۲۲٪ بچے قبل از وقت پیدا ہوتے ہیں۔

غذائیت میں کمی سب سے پہلے بچے کے جسم کو متاثر کرتی ہے ترقی یافتہ ملکوں میں عام طور پر نوزائیدہ ۳ سے چار کلو وزنی ہوتا ہے اور قد ۵۱ سنٹی میٹر۔ جبکہ ترقی پذیر ملکوں میں اسکا وزن ۲ سے ۲½ کلو اور قد ۴۶ سنٹی میٹر ہوتا ہے۔(۹)

امریکی ایڈ کی جانب سے شائع کردہ مذکورہ بالا کتاب میں ایک چارٹ کے ذریعہ پاکستان میں پیدا ہونے والے بچوں کے وزن اور قد کا مقابلہ یورپ میں پیدا ہونے والے بچوں سے کیا گیا ہے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔(۱۰)

ایک سال کی عمر قد انچوں میں وزن پاؤنڈ میں	دو سال کی عمر قد انچوں میں وزن پاؤنڈ میں	تین سال کی عمر قد انچوں میں وزن پاؤنڈ میں	چار سال کی عمر قد انچوں میں وزن پاؤنڈ میں
یورپی بچہ ۳۰" ۲۳۶۲ پاؤنڈ	۳۴" ۲۸۶۶ پاؤنڈ	۳۹" ۳۳ پاؤنڈ	۴۱" ۳۷۶۴ پاؤنڈ
پاکستانی بچہ ۲۲" ۱۵۶۴ پاؤنڈ	۲۳۶۷" ۱۹۶۸ پاؤنڈ	۳۰" ۲۲۶۰ پاؤنڈ	۳۲" ۲۴۶۴ پاؤنڈ

ترقی یافتہ ملکوں اور پاکستان میں بچے کی نشوونما کے دوران قد اور وزن میں اتنا فرق اس غربت کی وجہ سے ہے جو اس وقت پاکستان میں موجود ہے ہمارا بچہ اکثر جسمانی عوارض اور کمزوریاں ماں کے پیٹ ہی سے لیکر پیدا ہوتا ہے اور اس کی وجہ ماں کا تصور نہیں بلکہ اس کی غربت ہے۔

جناح پوسٹ گریجوایٹ میڈیکل کالج کراچی کے بچہ وارڈ میں کی گئی ایک ریسرچ کے مطابق جن ماؤں کا معائنہ کیا گیا ان میں دودھ کی مقدار اتنی کم تھی کہ بچے کا پیٹ بھرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ یعنی یہ مقدار ۲۴ ملی لیٹر سے لیکر ۱۲۰[11] ملی لیٹر تک تھی (۲۴ گھنٹوں کے اندر) یاد رہے کہ کوکا کولا کی ایک بوتل میں ۲۵۰ ملی لیٹر پانی ہوتا ہے یعنی ماں کی چھاتی میں جو دودھ ۲۴ گھنٹوں میں پیدا ہوا وہ کوکا کولا کی ایک بوتل کے دسویں حصہ سے لیکر اس کے آدھے سے کم تھا اس قدر کم دودھ کی مقدار سے بچوں کی صحت پر ہونے والے اثرات قابل فہم ہیں۔ دودھ کی کمی کا باعث گوشت، دودھ، مکھن، انڈے وغیرہ کے استعمال کا نہ ہونا ہے کیونکہ ہماری آبادی کی اکثریت اس قابل نہیں کہ وہ زچہ کو یہ سب کچھ مہیا کر سکے۔

پیدائش سے لیکر سکول میں داخلہ کی عمر تک بچے کو اچھی غذا کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اس غذا کے مہیا ہونے پر نہ صرف بچے کے جسم

کی نشوونما کا انحصار ہے بلکہ اس کی ذہنی ترقی بھی اس پر مبنی ہوتی ہے۔
لیکن پاکستان میں ہماری آبادی خاص طور پر کچی بستیوں، مزدوروں اور نچلے درمیانے طبقے کی آبادیوں میں غذا کی کمی عام چیز ہے۔ کراچی میں خداداد کالونی اور محمود آباد کالونی میں جو معلومات حاصل کی گئیں ان کے مطابق پانچ سال تک کی عمر کے بچوں میں پروٹین (لحمیات) کی کمی کی وجہ سے عدم غذائیت بہت بڑی مقدار میں موجود تھی۔ محمود آباد کالونی میں اکٹھے کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق کل ۱۱۰۰ بچوں کا معائنہ کیا گیا جو پانچ سال کی عمر سے کم کے تھے۔ ان میں سے صرف ۲۶٫۷ فیصد بچے نارمل پائے گئے جبکہ ۳۶٫۳ فیصد بچے غذائی کمی کا شکار تھے اور ۳٫۴ فیصد بچے توسنگین طور پر پروٹین کلوری کی عدم غذائیت میں مبتلا تھے۔

جناح پوسٹ گریجوایٹ میڈیکل کالج کے بچوں کے ہسپتال کے آوٹ ڈور حصہ (بیرونی مریضوں کا شعبہ) میں لائے جانے والے بچوں میں سے ۸۰٪ غذائی کمی کا شکار نکلے۔ جبکہ ہسپتال میں داخل کئے جاتے والے بچے قریباً سب کے سب عدم غذائیت سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار تھے۔ جن بچوں کا معائنہ کیا گیا ان کے والدین کی ماہوار آمدنی ایک ہزار روپے سے کم تھی۔

محمود آباد کالونی کراچی میں جن عورتوں کا معائنہ کیا گیا ان میں سے صرف ۳۹٪ اس قابل تھیں کہ بچے کو چھ ماہ تک چھاتی کا دودھ پلاسکیں اور صرف ۲۳٪ عورتیں پورے بارہ مہینے اپنا دودھ پلانے کی صلاحیت رکھتی تھیں[۱۳]۔

پاکستان میں زچگی کے ایام میں اموات ہوں یا بچوں کی اموات یا غریب اور نچلے درمیانے طبقے کی بستیوں میں بیماریاں۔ ان سب کا باعث ایک طرف ناکافی غذا اور دوسری جانب غیر صحت مند رہائشی ماحول ہے یہاں پینے کا صاف پانی میسر نہیں جبکہ امیر بستیوں میں امراء کے ذوق کی تسکین کی خاطر فوارے لگائے جاتے ہیں غریب آبادیوں میں غلاظت کے نکاس کا بندوبست نہیں جبکہ امراء کی بستیاں منصوبہ بندی کے مطابق تعمیر کی گئی ہیں غریب بچوں کے لئے کھیلنے کی جگہ نہیں جبکہ اسی شہر کے امیر علاقوں میں بڑے بڑے پارک ہیں جو خالی پڑے رہتے ہیں۔ امراء کے رہائشی علاقوں میں سڑکیں روشنی سے جگمگاتی ہیں غریب بستیاں روشنی اور ہوا سے محروم ہیں۔

صحت پر سرکاری اخراجات

ان حالات میں جبکہ غذائی کمی اور غیر صحت مند رہائشی ماحول کی وجہ سے پاکستان میں ہر سال ۵۲ ہزار عورتیں زچگی کے دوران اور لاکھوں بچے سکول جانے کی عمر سے پہلے مرجاتے ہیں نیز آبادی کے دوسرے حصوں میں بھی ٹی بی، ملیریا، نمونیہ، ٹائیفائیڈ، پیچش، اسہال اور دیگر متعدی امراض لاکھوں افراد کی موت کا باعث بنتے ہیں عوام کی صحت پر انتہائی حقیر رقم خرچ کی جارہی ہے۔ پاکستان میں حکومت کی جانب سے صحت عامہ پر کل اخراجات ۱۶/ روپے فی کس یا ایک ڈالر کے برابر ہیں۔ حکومت کی جانب سے صحت پر کم اخراجات کے حوالے سے بھی پاکستان عالمی ریکارڈ کا حامل ہے یہ دنیا کے ان دس ملکوں میں سے ہے جہاں حکومت صحت پر سب سے کم اخراجات کرتی ہے۔ صحت پر اخراجات کے سلسلے میں کچھ عالمی اعداد و شمار درج ذیل ہیں۔[۱۴]

ملک	صحت پر سالانہ اخراجات (ڈالروں میں)
سویڈن	۹۲۴ ڈالر
مغربی جرمنی	۶۷۶ 〃
امریکہ	۳۸۴ 〃
سوویت یونین	۹۱ 〃
ایران	۳۵ 〃
عراق	۲۱ 〃
پاکستان	۱ 〃

پاکستان میں جہاں حکومت کی جانب سے ایک ڈالر فی کس صحت پر
خرچ کیا جاتا ہے وہاں دفاع پر فی کس ۱۲ ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں اور ہر فوجی
پر فی کس ۲,۷۷۵ ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں اس کا نتیجہ ظاہر ہے پاکستان میں
جیساکہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ ٹی بی سے ہر سال ایک لاکھ افراد لقمہ اجل بن جاتے
ہیں، جبکہ اندھے پن کے ضمن میں پاکستان دنیا کے دوسرے نمبر پہ ہے یہاں پر
۱۵ لاکھ اندھے موجود ہیں پاکستان اوسط عمر کے اعتبار سے دنیا میں ۹۵ نمبر پہ ہے
اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔

ملک	مردوں کی اوسط عمر	عورتوں کی اوسط عمر
جاپان	۷۲ سال	۷۷ سال
مغربی جرمنی	۶۹ سال	۷۵ سال
برطانیہ	۶۹ سال	۷۶ سال
امریکہ	۶۸ سال	۷۶ سال
سوویت یونین	۶۴ سال	۷۴ سال
چین	۶۰ سال	۶۴ سال
پاکستان	۵۳ سال	۴۸ سال

حکومت کی جانب سے صحت پر ہونے والے اخراجات میں
کمی کی بنا پر آبادی کی اکثریت کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں
ہسپتالوں کی اور ہسپتالوں میں موجود بستروں، ڈاکٹروں اور نرسوں کی کمی
ہے۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت یہاں کل ہسپتالوں کی تعداد
۲۹۲ تھی جبکہ ۱۹۷۸ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۵۲۸ ہوگئی یعنی دوگنا سے
کسی قدر کم۔

کسی ملک میں حکومت کی جانب سے صحت پر اخراجات کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ملک میں موجود ہسپتالوں میں مریضوں کے لئے کتنی سہولتیں موجود ہیں اس وقت ہر جگہ سرکاری ہسپتال بری حالت میں ہیں۔ ان میں آنے والے مریضوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ہسپتال کے ناکافی عملہ کے لئے مریضوں کی مناسب دیکھ بھال کرنی ممکن ہی نہیں ہوتی آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر ان ہسپتالوں میں جسقدر توسیع کرنی ضروری تھی اتنی نہیں کی گئی۔ یہاں ہر چیز کی کمی ہے۔ ڈاکٹروں سے لیکر نرسوں، دوائیوں غرضیکہ ہر چیز کی۔ ہسپتالوں میں مریضوں کے لئے مناسب تعداد میں بستر نہیں ہوتے۔ ذیل میں ہم دنیا کے مختلف ملکوں میں آبادی کے تناسب سے ہسپتالوں میں موجود بستروں کی تعداد کے اعداد و شمار پیش کرتے ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ پاکستان میں ان کی کتنی کمی ہے۔

ملک	آبادی کے تناسب سے کتنی آبادی کے لئے ایک بستر موجود ہے
سویڈن	۶۷ افراد کے لئے ایک بستر
سوویت یونین	۸۲ " " "
مغربی جرمنی	۸۵ " " "
جاپان	۹۴ " " "
پاکستان	۱۹۰۳ " " "

بالفاظ دیگر پاکستان میں قریباً دو ہزار افراد کے لئے ہسپتال میں ایک بستر موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہسپتالوں میں مریضوں کو داخلہ بہت مشکل سے ملتا ہے اور بسا اوقات ہسپتال کی ڈیوڑھیوں اور برآمدوں میں مریض پڑے نظر آتے ہیں جہاں صفائی کا معیار اچھا نہیں ہوتا۔ یہی حال نرسوں کی فراہمی کا ہے جو مریضوں کی دیکھ بھال میں انتہائی اہم کردار

ادا کرتی ہیں۔ پاکستان کل آبادی کی نرسوں اور دوائیوں کے ساتھ تناسب کے حوالے سے دنیا کے پسماندہ ترین ملکوں میں سے ہے۔ اس ضمن میں بھی کچھ اعداد و شمار ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

ملک	کتنے مریضوں کے لئے ایک نرس دستیاب ہے
سویڈن	۱۲۶ 〃 〃 〃
امریکہ	۱۴۸ 〃 〃 〃
روس	۱۶۳ 〃 〃 〃
پاکستان	۴,۹۵۲ 〃 〃 〃

پاکستان کے دیہی علاقوں میں حکومت کی جانب سے مہیا کردہ صحت کی سہولتیں شہروں کے مقابلہ میں ابھی ناقص ہیں۔ دیہی ڈسپنسریوں میں دوائیاں موجود نہیں ہوتیں۔ اکثر اوقات ڈاکٹر بھی غیر حاضر ہوتے ہیں دیہات میں ڈاکٹروں کی تعداد بھی آبادی کے تناسب سے کم ہوتی ہے۔ اس وقت دیہی علاقوں میں ڈاکٹروں کے لئے ۱۰۰۰ ملازمتیں ہیں جبکہ شہروں میں ۶,۰۰۰ ہیں۔ ڈسپنسر مریضوں سے پیسے بٹورتے ہیں اور ڈاکٹر آپریشن کرنے کے لئے مریض سے فیس کا مطالبہ کرتے ہیں اکثر دیہی ڈسپنسریاں اور صحت کے مراکز دیہات سے دور واقع ہوتے ہیں۔ سڑکیں ناکافی اور خستہ ہونے کی بنا پر مریض عطائیوں کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ عطائی انہیں جو دوائیاں دیتے ہیں ان سے مرض ٹھیک ہونے کی بجائے کئی اور امراض بیمار کو لاحق ہو جاتے ہیں۔ جعلی دوائیوں کا کاروبار اس کے علاوہ ہے۔ بڑے شہروں میں بھی جعلی دوائیاں بکتی ہیں لیکن تعلیم زیادہ ہونے کی بنا پر نیز شہری آبادی کے نسبتاً زیادہ ہوشیار ہونے کی بنا پر شہروں میں انہیں فروخت کرنا نسبتاً دشوار ہوتا ہے۔ جعلی دوائیاں بنانے والے دیہی مریضوں کے بھول پن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان علاقوں میں جعلی دوائیوں کا دھندہ شروع کئے ہوتے ہیں جن کی وجہ

سے صحت کا معیار گرتا ہے اور اموات عام ہو جاتی ہیں۔ چھوٹے صوبوں میں حالات اور بھی خراب ہیں، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں ہسپتالوں، ڈسپنسریوں، نرسوں اور ڈاکٹروں کی تعداد پنجاب سے بھی کم ہے۔ دور دراز کے پہاڑی علاقوں اور دیہات میں بیمار پڑنے پر مریض کے دوا دارو کا کوئی بندوبست موجود نہیں ہوتا۔ شمالی علاقوں آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد کے پہاڑی علاقوں میں لوگ اسپرین کی گولی کو سر درد سے لیکر نمونیہ اور کینسر تک کیلئے استعمال کرتے ہیں (بشرطیکہ یہ گولی انہیں دستیاب ہو سکے) ان علاقوں میں جن لوگوں نے باہر سے جاکر سفر کیا ہے وہ بتائیں گے کہ لوگ کس التجا کے ساتھ مسافر سے کسی بھی دوائی کی گولی کی درخواست کرتے ہیں۔

پاکستان میں اسوقت ہزاروں کی تعداد میں ڈاکٹر بیکاری کا سامنا کر رہے ہیں ایک اندازے کے مطابق صرف صوبہ سندھ میں ۲/۱ ۶ ہزار کے قریب ڈاکٹر بیکار ہیں[15]۔ سترہ اٹھارہ اور بعض اوقات بیس برس تک پڑھائی کرنے کے بعد ڈاکٹر کو ساڑھے نو سو روپے ماہوار کا ہاوس جاب بھی نہیں ملتا۔ حکومت کا کہنا ہے کہ ڈاکٹروں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے" چنانچہ ۱۹۸۵ء میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ میڈیکل کالجوں میں داخلوں کی تعداد کم کر دی جائے کیا ڈاکٹر پاکستان میں ضرورت سے زیادہ ہیں ؟ حقیقت اس کے برعکس ہے پاکستان میں آبادی کے تناسب سے ڈاکٹروں کی تعداد بہت کم ہے اس کا اندازہ بھی مندرجہ ذیل عالمی اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے

ملک	کتنی آبادی کے لئے ایک ڈاکٹر موجود ہے
سوویت یونین	۲۸۹ افراد کے لئے ایک ڈاکٹر
مغربی جرمنی	۴۲۰ " " "
امریکہ	۵۹۵ " " "
پاکستان	۳,۷۷۹ " " "

جہاں پاکستان میں ایک طرف حکومت نوجوان ڈاکٹروں کو ملازمت مہیا کرنے میں ناکام ہوئی ہے وہاں پاکستان کے بڑے شہروں میں غیر ملکی ڈگریاں رکھنے والے ڈاکٹروں نے ڈاکٹری کے پیشے کو ایک انڈسٹری میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان ڈاکٹروں نے بڑے بڑے پرائیویٹ کلینک اور ہسپتال کھول رکھے ہیں جہاں صرف وہی مریض داخل ہو سکتا ہے جو سو روپے سے لیکر تین سو روپے تک مشورے کی فیس دے سکے اور سینکڑوں روپے یومیہ پر کمرہ کرائے پر لینے کی استعداد رکھتا ہو۔ ان پرائیویٹ کلینکوں اور ہسپتالوں سے پاکستان کی آبادی کا ۵٪ کھاتا پیتا اور خوشحال حصہ فائدہ حاصل کرتا ہے جبکہ ۹۵٪ فیصد آبادی کو ان نام نہاد سرکاری ہسپتالوں میں دھکے کھانے کے لیے دھکیل دیا جاتا ہے جہاں نہ ڈاکٹر مناسب تعداد میں دستیاب ہیں نہ نرسیں ہیں نہ بستر ہیں اور نہ ادویات اور نہ ہی صفائی کا خیال رکھا جاتا ہے۔

پاکستان میں موجود غربت کا اظہار کم آمدنی، بے کاری، غیر صحت مند رہائشی سہولتوں اور نامناسب خوراک کے علاوہ تعلیم کی کمی اور چائلڈ لیبر (مزدوری کرنے والے بچوں) کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔

آزادی کے اتنے سال گذر جانے کے بعد بھی پاکستان تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہے۔ یہاں پر سکولوں اور دیگر تعلیمی اداروں کا مناسب بندوبست نہیں ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ حکومت تعلیم پر صحت کیطرح بہت کم اخراجات کرتی ہے۔ ملک میں معاشی بدحالی اور دوسری طرف تعلیمی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے پاکستان میں ناخواندہ لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اقوام متحدہ کی جانب سے تیار کردہ اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں ۷۳٪ سے زیادہ لوگ ان پڑھ ہیں۔ چنانچہ بشرح خواندگی کے لحاظ سے پاکستان دنیا کے دس سب سے نیچے ملکوں میں سے ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان ہندوستان سے بھی پیچھے ہے جہاں ۶۶٪ کے قریب لوگ ناخواندہ ہیں۔ ناخواندہ ملکوں کی فہرست میں

پاکستان کا شمار افغانستان، بنگلہ دیش اور نیپال جیسے ملکوں کے ساتھ ہوتا ہے ظاہر ہے کہ تعلیم نہ ہونے کی بنا پر پاکستان سائنسی اور تکنیکی میدانوں میں ترقی نہیں کر سکتا۔ ان پڑھ آبادی جدید صنعتی اداروں کو چلانے کی اہلیت بھی نہیں رکھتی۔ تعلیمی پسماندگی کے لحاظ سے پاکستان میں عورتوں کا حال مردوں سے بھی بد تر ہے۔ پاکستان میں صرف ٪ ۶ عورتیں خواندہ ہیں۔

پاکستان میں ناخواندگی کی ایک اہم وجہ معاشی بد حالی بھی ہے۔ والدین اس قابل نہیں ہوتے کہ بچوں کو تعلیم دلا سکیں اس کی بجائے وہ بچوں کو کام پر لگا دیتے ہیں تاکہ بچے اپنا پیٹ بھرنے کے ساتھ ساتھ والدین کے لئے بھی معاشی سہارا ثابت ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں ملازمت کرنے والے بچے تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ اس وقت شہروں میں پنکچر لگانے کی دوکانوں چائے کے کھوکھوں، ہوٹلوں سے لیکر قالین بافی اور دیگر چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں ہر جگہ نو، دس سال بلکہ بعض دفعہ اس سے بھی کم عمر کے بچے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ چائے کے کھوکھے پر کام کرنے والے بچوں کو بعض اوقات صبح چار بجے اٹھا دیا جاتا ہے اور رات گیارہ بجے تک کام لیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں جو صورت حال انیسویں صدی کے آغاز میں تھی وہ پاکستان میں آج دیکھنے میں آتی ہے۔ کم عمر بچے جنہیں سکول جانا چاہیئے تھا۔ جون جولائی کی چلچلاتی دھوپ میں سڑکوں پر بیٹھ کر جوتے پالش کرتے ہیں اور سردیوں میں ٹھٹھرتے ہوتے پنکچر کی دوکانوں پر ملتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان میں جتنی بھی چھوٹی انڈسٹری ہے وہ کم عمر بچوں کی محنت پر قائم ہوئی ہے اور اسی پر چل رہی ہے۔

یہ بچے دور دراز کے علاقوں سے آتے ہیں۔ پنجاب کے بڑے شہروں بالخصوص لاہور میں دیر، مردان، پشاور سے بچے آکر جوتوں کے پالش کا کام کرتے ہیں۔ ریڑھیوں پہ مکئی بھون کر فروخت کرتے ہیں یا مونگ پھلی اور شکر قندی بیچتے ہیں۔ ایبٹ آباد اور ہزارہ سے بچے آکر ہوٹلوں اور کھوکھوں

میں کام کرتے ہیں۔ پنجاب کے دیہات اور شہروں کے نواح سے آکر بچے پنکچر کا کام اور چھوٹی انڈسٹری میں معمولی اجرت پر کام کرتے ہیں

نواحی علاقوں سے آنے والے بچے پہلے دو تین سال بغیر اجرت کے اور پھر دو تین روپے روزانہ پر کام کرتے ہیں۔ کام سکھانے کے نام پر ان کا بدترین استحصال کیا جاتا ہے۔ وہ گھر سے رومال میں روٹی باندھ کر لاتے ہیں۔ اور چھولے خرید کر اس سے کھاتے ہیں۔ اس معمولی اجرت میں سے بس کا کرایہ بھی انہیں ادا کرنا پڑتا ہے۔ ان بچوں کی زندگی بہت تکلیف دہ ہے اور انہیں ہر قسم کی بدسلوکی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن گھر میں صرف ایک کمانے والا فرد ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ بھی زندہ نہیں رہتا۔ اس لئے والدین مجبور ہو کر انہیں کام پر لگا دیتے ہیں اگر بچیوں کی تعداد زیادہ ہے تو پھر لڑکے کو بہر حال سکول جانے کی بجائے روزی کی تلاش کرنی پڑتی ہے کیونکہ اسے بڑے ہو کر اپنی بہنوں کی شادی کا ذمہ بھی لینا ہوتا ہے

اگر کوئی باپ یہ سمجھ لیتا ہے کہ بچے شائد روزگار بھی حاصل نہ کر سکیں یا یہ کہ بچوں کا مستقبل شائد تاریک ہو۔ یا اگر اسے یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کی پرورش نہیں کر سکتا تو پھر وہ اس ۲۴ سالہ نوجوان غلام رسول کا راستہ اختیار کر لیتا ہے جس نے غربت اور بیماری سے تنگ آکر اپنی بیوی اور چار معصوم بچیوں کو چھری سے ذبح کر دیا تھا اور اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا

حوالہ جات

۱۔ مظفر حسین کا مضمون "The Decaying Metropolis"
پاکستان اینڈ گلف اکانومسٹ دسمبر ۱۳-۷ ۱۹۸۵ء

۲۔ دیکھئے : "The New Book of World Rankings:"
G.T. Kurian; New York; 1981

۳۔ دیکھئے مذکورہ کتاب

۴۔ دیکھئے مذکورہ کتاب

۵۔ مظفر حسین : مذکورہ بالا مضمون

۶۔ دیکھئے عمر اصغر خاں مضمون بعنوان "معاشی ترقی کے ۳۸ سال" (انگریزی)
روزنامہ "مسلم" اسلام آباد
۸ ستمبر ۱۹۸۵ء

۷۔ ملاحظہ ہو : "Pakistan Basic Facts 1977-78"
اسلام آباد صفحہ ۱۰۲ مطبوعہ حکومت پاکستان فنانس ڈویژن

۸۔ ملاحظہ ہو :
"Synopsis of Hygiene and Public Health"
Edit., K.S. Shah. P: 227; Lahore 1983

۹۔ ملاحظہ ہو :
"Community Medicine" Edit., M. Ilyas
and M.A. Ansari; P. 9; Lahore, 1983

۱۰۔ دیکھئے :
"Pakistan Economic Development Data",
U.S. Aid, Islamabad, 1975

۱۱۔ ملاحظہ ہو : الیاس اور انصاری کی مذکورہ کتاب !
"Community Medicine" میں رضیہ جے رحمت اللہ کا مضمون

*

۱۲۔ ملاحظہ ہو : مذکورہ بالا کتاب کا صفحہ ۲۰ اور اس سے آگے۔

۱۳۔ مذکورہ بالا کتاب کا صفحہ ۲۰

۱۴۔ ملاحظہ ہو G.T. Kurian

" مذکورہ بالا کتاب

۱۵۔ رفیق جابر کا مضمون

"Young Medicos: in Search of House Jobs"

پاکستان اینڈ گلف اکانومسٹ دسمبر ۲۸ تا جنوری ۳، ۱۹۸۵ء

باب ۲

پاکستان میں غربت کی وجوہات

پاکستان میں غربت کے جو مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں وہ کیوں وجود میں آتے ؟

پاکستانی عوام کس لئے افلاس کے ہاتھوں مجبور ہیں؟ وہ کیا وجوہات ہیں جنہوں نے پاکستان میں بیماری، بیکاری، اور تنگدستی کو جنم دیا ہے؟

پاکستان میں وسائل زندگی کی کمی نہیں۔

پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ جہاں گندم چاول، گنا، کپاس، تمباکو اور کئی دیگر اجناس بافراط پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ اجناس ہم بیرون ملک برآمد بھی کرتے ہیں۔ پاکستان کا صوبہ پنجاب پانچ دریاؤں کی گذرگاہ ہے جو اس علاقے کی زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ جبکہ صوبہ سندھ پاکستان کے سب سے بڑے دریا دریائے سندھ سے سیراب ہوتا ہے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں زمین کے وسیع قطعات موجود ہیں جنہیں اگر پانی میسر ہو تو لہلہاتی فصلیں پیدا کی جا سکتی ہیں پاکستان میں بجلی اور پانی کی کمی ہے لیکن اگر موجودہ وسائل ہی کو ٹھیک طریقے سے استعمال میں لایا جائے تو اس کمی کا خاتمہ کرنا ممکن ہے۔ وسائل کو منظم کرنے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہے ہمارے بورژوا ماہرین معیشت اور سرکاری اہل کار کہتے ہیں کہ پاکستان میں سرمایہ موجود نہیں اس لئے وہ سامراجی ملکوں سے قرض حاصل کرنے کی پالیسی کی حمایت کرتے ہیں۔

پاکستان معدنی وسائل کی فراوانی کے اعتبار سے بھی اچھی

حیثیت کا حامل ہے یہاں پر طرح طرح کی معدنیات موجود ہیں۔ ابھی تک پورے پاکستان کا مکمل ارضیاتی سروے نہیں کیا جا سکا۔ اس کی وجہ بھی سرمائے کی کمی بیان کی جاتی ہے۔

پاکستان میں اب تک ایک ہزار ملین ٹن سے قریب کوئلے کے ذخائر کا پتہ لگایا جا چکا ہے۔ پاکستان کے سوئی گیس کے ذخائر دنیا میں چھٹے نمبر پر ہیں اور تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اگر چار سے پانچ سال کے دوران پندرہ ارب روپے کی سرمایہ کاری کی جائے تو تیل کے سلسلے میں خود انحصاری پیدا کرنی ممکن ہے۔ سندھ، سرحد اور بلوچستان کے علاقے میں ریڈیائی دھاتوں کی دریافت بھی کی گئی ہے۔ اب تک یورینیم کے دو ہزار ٹن ذخائر کا پتہ لگایا جا چکا ہے۔ پاکستان میں جپسم بے انتہا مقدار میں پایا جاتا ہے جو کھاد اور سیمنٹ بنانے کے کام آتا ہے۔ شیشہ سازی کی صنعت میں استعمال ہونے والی سیلیکا سینڈ بھی اتنی زیادہ ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتی۔ یہی حال نمک کا ہے جو روزمرہ کے استعمال کے علاوہ صنعت میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سنگ مرمر، ڈولومائیٹ، گندھک اور بے شمار دیگر معدنیات بھی بافراط پائی جاتی ہیں۔

دراصل پاکستان کا مکمل ارضیاتی سروے جب تک نہیں کیا جاتا پاکستان میں موجود معدنیاتی دولت کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا اور یہ کام بھی سرمایہ کاری کے بغیر ممکن نہیں۔

پاکستان افرادی طاقت سے بھی مالا مال ہے۔ یہاں کے عوام ہنرمند ہیں۔ وہ جدید سے جدید ٹیکنالوجی کو سمجھنے اور اپنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پاکستان کے محنت کش یورپ وامریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کے علاوہ مڈل ایسٹ میں اپنی محنت اور قابلیت کا اعتراف کروا رہے ہیں یہ محنت کش دنیا کے سرد ترین ملکوں سے لیکر سعودی عرب اور خلیج کے گرم ملکوں تک سخت محنت سے ان ملکوں کی ترقی میں اضافہ کر رہے ہیں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں ہر طرف غربت اور تنگ دستی کے مظاہر نظر آتے ہیں؟ پاکستان میں محنت کش کی محنت سے صرف غربت کی فصل کیوں اگتی ہے؟ یہ کیا وجہ ہے کہ وسائل کی فراوانی کے باوجود ملک کے لاکھوں عوام کو تن ڈھانپنے کا کپڑا میسر نہیں۔ انہیں صحت مند ماحول، مناسب رہائشی سہولتیں نہیں ملتیں، بیماری اور افلاس ان کا مقدر بنے نظر آتے ہیں؟ ہم کیوں پانی اور بجلی کے وسائل کو ترقی نہیں دے سکتے، بنجر زمینوں کو زیر کاشت نہیں لا سکتے، معدنیات کو دریافت نہیں کر پاتے اور معاشی میدان میں پسماندہ ہیں؟

ہمارے بورژوا ماہرین معیشت اس کی وجہ سرمائے کی کمی بیان کرتے ہیں لیکن کیا پاکستان میں واقعی سرمائے کی کمی ہے۔ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں سرمایہ موجود نہیں۔ دوسری جانب مختلف طریقوں سے جن میں سامراجی قرضے اور تجارت بھی شامل ہیں اور کثیر القومی کمپنیوں کی لوٹ مار بھی پاکستان سے سرمایہ دھڑا دھڑ بیرون ملک منتقل کیا جا رہا ہے۔ یہ سرمایہ پاکستانی معیشت کا ایک طرح سے خون ہے جسے ان مختلف جونکوں کے ذریعے سامراجی ملک پاکستان کے جسم سے نکال رہے ہیں۔ یہ کیسے ہو رہا ہے؟ اس کی مختصر سی تفصیل اگلے صفحات میں قارئین کے سامنے پیش کی جائے گی۔

اس وقت ہمارا مقصد پاکستان کی سامراجی لوٹ مار کے مختلف طریقوں کو منظر عام پر لانا ہے اس لوٹ مار میں پاکستان کے استحصالی طبقات بھی شامل ہیں پاکستان کے جاگیردار زرعی سرمایہ دار، بڑے صنعتکار اور پاکستان کی افسر شاہی بھی پاکستان کے عوام کی غربت کے ذمہ دار ہیں، یہ طبقات افسر شاہی کے ساتھ مل کر پاکستانی عوام کا خون نچوڑتے ہیں اور اسے ملک سے باہر منتقل کر دیتے ہیں۔

پاکستان ان طبقات کی لوٹ مار کی وجہ سے بھی غربت اور

پسماندگی کا شکار ہے پاکستان کے استحصالی طبقات کس طرح پاکستان کی معاشی ترقی میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس موضوع پر علیحدہ لکھنے کی ضرورت ہے۔

باب ۳

سامراجی قرضوں کے معیشت پر اثرات

پنجاب کے قصبہ شرقپور کے قریب ایک گاؤں کا نام "داتری والاکھوہ" ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس صدی کے آغاز میں ایک دیہاتی شرقپور کے قصبے میں درانتی خریدنے آیا۔ اس مقصد کے لئے اس نے مقامی ساہوکار سے پانچ آنے قرض لیا۔ اس قرض پر سود بڑھتے بڑھتے اتنا ہوگیا کہ اگلے بیس سال کے عرصہ میں اسے اپنی چاہی اراضی سے دست بردار ہونا پڑا اور یہ ساہوکار کے قبضہ میں چلی گئی وہ گاؤں جہاں پر اس دیہاتی کا کنواں اور اراضی موجود تھی " داتری والاکھوہ " کے نام سے مشہور ہوا۔

آج دنیا کے سامراجی ملکوں بالخصوص امریکہ نے عالمی سطح پر اسی طرح کے ایک ساہوکار کی شکل اختیار کر لی ہے جو تیسری دنیا کے غریب ملکوں کو" قرضہ کے ذریعہ ترقی " کا جھانسہ دے کر انہیں اپنا مقروض بناتا ہے۔ حتیٰ کہ قرض لینا ان ملکوں کی عادت بن جاتا ہے اور وہ افیون کے نشے کی طرح سے قرضہ لینے کے اسقدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اپنے محنت کش عوام کی پیدا کی ہوئی دولت سامراجی ملکوں کے حوالے کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر لاطینی امریکہ کے ملک معدنی ذخائر سے مالا مال ہونے کے باوجود عالمی ساہوکاروں کے قرضوں میں جکڑے ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں انہیں ہر سال ۴۵ ارب ڈالر کی رقم سود کے طور پر سامراجی ملکوں کو ادا کرنی پڑتی ہے اس لحاظ سے ترقی یافتہ سامراجی ملک لاطینی امریکہ کے جسم

سے بے رحم ساہوکار کی طرح سے خون نچوڑ لیتے ہیں۔ لاطینی امریکہ سے اتنی بڑی مقدار میں سرمایہ سامراجی ملکوں کو منتقل کرنے کے نتیجے میں امریکہ، جرمنی، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی ترقی میں لاطینی امریکہ کے مزدوروں اور کسانوں کا خون اور پسینہ شامل ہو جاتا ہے۔

لاطینی امریکہ کے ملک ہی سامراج کے مقروض نہیں بلکہ ایشیا، اور افریقہ کے اکثر ملک آج سامراجی قرضوں کے شکنجے میں جکڑے ہوتے ہیں۔ ان قرضوں کی مقدار اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں کو ان کی ادائیگی مشکل نظر آ رہی ہے کہا جا رہا ہے کہ دنیا اس وقت "قرضوں کے بم" پر بیٹھی ہے جو کسی وقت بھی پھٹ کے عالمی سرمایہ داری نظام کو جڑوں سے ہلا سکتا ہے۔

تیسری دنیا کو سامراجی قرضوں کا آغاز دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ ۱۹۷۱ اور ۱۹۸۰ کے درمیان یہ عالمی سامراجی قرضے بہت تیزی کے ساتھ بڑھے یہ قرضے شروع میں براہ راست امریکہ اور دیگر سامراجی ملک تیسری دنیا کی حکومتوں کو دیتے تھے تاہم سامراجی ملکوں کے نجی بینکوں کو ان قرضوں میں بہت منافع نظر آیا اور انہوں نے بھی تیسری دنیا کو بڑھ چڑھ کر قرضے دینے شروع کئے۔ ان قرضوں پر شرح سود بہت زیادہ ہے ۱۹۷۱ء میں تیسری دنیا کو دیئے جانے والے کل قرضوں کی مقدار ۷۸ ارب ڈالر تھی جبکہ ۱۹۸۰ء میں یہی مقدار بڑھ کر ۴۲۶ ارب ڈالر بن گئی ۱۹۸۰ء تک کل عالمی قرضوں کا ۳/۲ حصہ تیسری دنیا کے ۱۳ ملکوں کے ذمے تھا۔ ان میں سے پہلے دس ملکوں کے قرضوں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

نام ملک	مقدار قرض ارب ڈالروں میں
۱۔ برازیل	تقریباً ۵۵ ارب ڈالر
۲۔ میکسیکو	" ۳۲٫۵ " "
۳۔ انڈیا	" ۱۷ " "

نام ملک	مقدار قرض ارب ڈالروں میں
۴۔ جنوبی کوریا	تقریباً ۱۷ ارب ڈالر
۵۔ الجیریا	〃 ۱۶ 〃 〃
۶۔ یوگوسلاویہ	〃 ۱۵ 〃 〃
۷۔ انڈونیشیا	〃 ۱۵ 〃 〃
۸۔ ترکی	〃 ۱۵ 〃 〃
۹۔ مصر	〃 ۱۳ 〃 〃
۱۰۔ اسرائیل	〃 ۱۳ 〃 〃

یہ ایک لحاظ سے ہماری جوتی اور ہمارا سر کی مثال ہے کیونکہ سامراجی بینکوں کو یہ روپیہ تیسری دنیا کے تیل پیدا کرنے والے ملکوں سے حاصل ہوا تھا۔ عرب بادشاہ اور شیخ تیل کی اربوں ڈالر کی آمدنی غیر ملکی سامراجی بینکوں میں جمع کراتے تھے اور یہ بینک اسی روپے سے مزید روپے کمانے کے لئے تیسری دنیا کے ملکوں کو قرض پر دے دیتے تھے یہ عمل اب بھی جاری ہے۔

۱۹۸۰ء میں پاکستان کے ذمے ۸½ ارب ڈالر سے زیادہ کا قرض واجب الادا تھا تاہم ان اعداد و شمار میں ۱۹۸۰ء کے بعد بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے اور اس وقت پاکستان تقریباً ۱۳ ارب ڈالر کا مقروض ہے۔

قرض کی شرائط

سامراج کے لئے قرضے دینا اسی طرح سے ضروری ہے جس طرح سے ساہوکار اور بنیئے کے لئے سودی کاروبار کرنا۔ قرضوں کے کاروبار سے سامراجی ملک تیسری دنیا کے وسائل پر کنٹرول قائم کرتے ہیں اور ان ملکوں کی لوٹ کھسوٹ کرنے کی کھلی چھٹی حاصل کر لیتے ہیں معاشی لوٹ کھسوٹ کے ساتھ ساتھ وہ تیسری دنیا کے ملکوں کو اپنی عالمی حکمت عملی کا حصہ بننے پر مجبور کر دیتے ہیں چنانچہ سامراجی قرضوں کی شرائط انہی مقاصد کو مدنظر رکھ کر طے کی جاتی ہیں۔

یہ شرائط مندرجہ ذیل ہوتی ہیں۔

(ا) سامراجی قرضوں کا ایک حصہ بطور پہلی قسط کے قرضہ دیتے ہی وصول کر لیا جاتا ہے قرضے کی کل رقم ادا کرنے کی بجائے کم رقم ادا کی جاتی ہے اور زیادہ لکھوا لی جاتی ہے۔

(ب) قرضہ کے ذریعے خریدی جانے والی تمام اشیاء صرف قرض خواہ ملک ہی سے خریدی جا سکتی ہیں۔ امریکی قرضوں کے ذریعہ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی خواہ وہ پین ہو یا پنسل امریکہ کے علاوہ کسی دوسرے ملک سے نہیں خریدی جا سکتی چنانچہ اسکا امریکہ کو دوہرا بلکہ تہرا فائدہ ہوتا ہے ایک طرف امریکہ اپنا مہنگا اور ناقص مال فروخت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو اگر کسی اور ملک سے خریدا جاتا تو بہت سستا ملتا۔ اگر امریکہ قرضہ نہ دے تو اس کا اکثر مال عالمی منڈی میں فروخت نہ ہو سکے۔ کیونکہ امریکہ میں مزدوروں کی نسبتاً زیادہ تنخواہ کی بنا پر نیز بعض اوقات مقابلتاً پرانی طرز کی مشینری پر تیار ہونے کی بنا پر اس مال پر لاگت بہت زیادہ ہو جاتی ہے پھر یہ کہ امریکہ نہ صرف مہنگا اور ناقص مال قرضوں کے ذریعہ فروخت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے بلکہ قرضوں پر سود کے ذریعے مزید منافع کماتا ہے۔

(ج) امریکی امداد کا ایک حصہ "امریکی ماہرین" کی شکل میں مقروض ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ یہ نام نہاد ماہرین بعض اوقات مقامی ماہرین کے مقابلہ میں بھی کم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ لاکھوں روپے ماہوار ہوتی ہے۔ اس طرح سے امریکہ اپنے ملک میں موجود نااہل کارکنوں کی ایک تعداد قرض کے ذریعہ تیسری دنیا کے ملکوں کے سر منڈھ دیتا ہے۔ اگر یہ کارکن قرض کے عالمی نظام کی بدولت تیسری دنیا کے ملکوں میں نہ بھیجے جائیں تو ان کے لئے امریکہ میں کوئی ملازمت نہ ہو گی۔ اس طرح امریکہ قرضہ دے کر اپنے ہاں بیکاری کا مسئلہ بھی حل کر لیتا ہے۔

(د) امریکی قرضے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ قرضے کی رقم سے خریدے جانے والے تمام مال کا ۵۰٪ امریکی جہازوں پر آئے گا اور ۵۰٪ قرضہ لینے والے ملک

کے جہازوں میں۔ چونکہ تیسری دنیا کے کئی ملکوں کے پاس اپنے جہازوں کا بندو بست نہیں اس لئے زیادہ تر قرضے کے ذریعے خریدا جانے والا مال امریکی بحری جہازوں کے ذریعے ہی آتا ہے جس سے امریکی بحری کمپنیوں کے کاروبار میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بات بھی امریکہ کے فائدے میں جاتی ہے۔

سامراجی ملک نہ صرف قرضے کی شرائط اس طرح کی رکھتے ہیں جن سے انہیں بے شمار معاشی فوائد حاصل ہوں۔ بلکہ قرضے کے ذریعے وہ تیسری دنیا کے مقروض ملکوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ انکے حسب منشاء معاشی پالیسیاں اختیار کریں اس سے تیسری دنیا کے ملکوں کی معیشت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ آزادانہ طور پر پالیسی سازی سے محروم ہو جاتے ہیں وہ قرض خواہوں کے اشارے پر اپنے عوام کی روٹی کا حصہ توڑ کر سامراجی ملکوں کو دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

عالمی بنک اور آئی ایم ایف کی شرائط

عالمی بنک اور آئی ایم ایف (انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ یا بین الاقوامی مالیاتی ادارہ) جنگ عظیم دوئم کے بعد سامراجی ملکوں نے ملکر قائم کئے تھے۔ یہ دونوں ادارے تیسری دنیا کے ملکوں کا قرض کے ذریعے استحصال کرنے میں پیش پیش ہیں۔ حال ہی میں ان اداروں نے پاکستان سمیت تیسری دنیا کے کئی ملکوں کو مندرجہ ذیل شرائط منظور کرنے پر مجبور کیا۔

(الف) قیمتوں میں چھوٹ کا خاتمہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ مہنگی اشیائے صرف عوام کو نسبتاً کم قیمت پر مہیا کرنے کے لئے حکومت جو رقم خرچ کرتی ہے وہ بند کر دی جائے اور مقامی آبادی پر خرچ کرنے کی بجائے قرض خواہوں کو دیدی جائے پاکستان میں راشن سسٹم کا خاتمہ اسی لئے کیا گیا ہے، کھاد اور کرم کش ادویات پر سے چھوٹ بھی عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے کہنے پر ختم کی گئی ہے ۸۰-۱۹۷۹ء میں خوردنی تیل

پر ۸۸½ کروڑ روپیہ بطور چھوٹ دیا جاتا تھا اسے ۸۳-۱۹۸۲ء میں ختم کر دیا گیا۔

(ب) بجلی، پانی گیس، ٹرانسپورٹ اور سماجی ضروریات کی چیزوں کے کرائے اور بل میں اضافہ۔ اسکا مقصد بھی یہی ہے کہ عوام سے زیادہ سے زیادہ پیسے بٹور کر انہیں سامراجی قرض خواہوں کے حوالے کر دیا جائے۔ پاکستان کے اندر گذشتہ چند سالوں میں ان تمام چیزوں کے کرایوں اور بلوں میں اضافہ اسی لئے ہوا ہے۔ حال ہی میں ہسپتالوں پر نافذ کی گئی بستر فیس بھی عالمی بینک اور آئی ایم ایف کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے اس کی ایک اور حالیہ مثال کراچی میں میونسپل کارپوریشن کو دیا جانے والا عالمی بینک اور ایشیائی ڈیویلپمنٹ بینک (اے ڈی بی) کا قرضہ ہے جو کراچی میں پانی کے وسائل کی ترقی کے لئے دیا گیا ہے اس حقیقت کے باوجود کہ کے ایم سی (کراچی میونسپل کارپوریشن) نے حال ہی میں پانی کے ریٹ میں دوگنا اضافہ کیا تھا۔ اسے مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ پانی کے ریٹ میں ۲۵٪ سے ۵۰٪ تک مزید اضافہ کرے۔

(ج) درآمدات پر ٹیکس (کسٹم ڈیوٹی) کم کر کے ملکی پیداوار اور استعمال پر ٹیکس (ایکسائز ڈیوٹی اور سیل ٹیکس) میں اضافہ کا مطالبہ۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ سامراجی ملکوں کا مال تیسری دنیا میں زیادہ سے زیادہ فروخت ہو، اس کے مقابلے میں ملکی مصنوعات کی قیمتیں بڑھ جائیں تاکہ ملکی مصنوعات سامراجی مصنوعات کا مقابلہ نہ کر سکیں۔

(د) صنعتوں اور تجارتی اداروں میں قومی ملکیت کا خاتمہ اور انہیں نجی شعبہ میں دیئے جانے کا مطالبہ عالمی بینک اور آئی ایم ایف قرضہ دیتے وقت اب یہ مطالبہ بھی کر رہے ہیں اس مطالبہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ مقامی سرمایہ داروں اور افسر شاہی کا ایک ایسا حلقہ پیدا کریں جو ہر وقت امریکہ اور دیگر سامراجی ملکوں کی تعریف کرتا رہے۔

(ہ) قیمتوں پر کنٹرول کا خاتمہ کا مطالبہ :
اسکا مقصد یہی ہے کہ سامراجی مصنوعات بھی اور مقامی سرمایہ داروں کی مصنوعات بھی منہ مانگی قیمتوں پر فروخت کی جاسکیں۔
(و) روپے کی قیمت کم کرنے کا مطالبہ پاکستان میں ۱۹۷۲ء میں سامراجی قرض خواہوں کے مطالبہ پر روپے کی قیمت ۱۳۰ فیصد کم کردی گئی تھی روپے کی قیمت میں اس کمی سے پہلے ایک ڈالر کی قیمت ۴/۷۵ تھی جنوری ۱۹۸۲ء تک ایک ڈالر ۹/۹۰ روپے ۹۰ پیسے کا ہو چکا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں ایک مرتبہ پھر بالواسطہ طریقے سے روپے کی قیمت کم کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ڈالر ۱۶ روپے کا مل رہا ہے (یعنی نومبر ۱۹۸۵ میں) روپے کی قیمت کم کرانے سے سامراجی ملکوں کو تیسری دنیا کی مصنوعات سستے داموں مل جاتی ہیں اسی طرح سے روپے کی قیمت کم کرانے سے سامراجی قرضوں کی مالیت میں اضافہ ہو جاتا ہے اگر روپے کی قیمت ۱۳۰ فیصد کم ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر ہم نے سو ڈالر کا قرضہ واپس کرنا ہے تو روپے کی قیمت کم ہو جانے سے اس کی مالیت راتوں رات بڑھ کر ۲۳۰ ڈالر ہو جائے گی۔
(ز) ٹریڈ یونینوں پر کنٹرول سامراجی ملک قرضہ دیتے وقت یہ مطالبہ بھی کرتے ہیں کہ تیسری دنیا کے مقروض ملک مزدور دشمن قوانین بنائیں اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پابندی عائد کریں۔

مندرجہ بالا شرائط تیسری دنیا کے ملکوں کو اس قابل نہیں چھوڑتیں کہ وہ آزادانہ طور پر اپنی پالیسیاں متعین کریں بلکہ یہ ملک سامراج کی معاشی غلامی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

سیاسی غلامی

سامراجی ملکوں کی معاشی امداد اور قرضے ہمیں سیاسی طور پر بھی

ان ملکوں کے محکوم بنا دیتے ہیں۔ سامراجی ملک ان قرضوں کے ذریعے مقروض ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے ہیں۔ سامراجی پالیسیوں کی مخالف سیاسی جماعتوں کو دبانے کے لئے مقروض ملک پر دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ سی آئی اے کی کارروائیاں زور پکڑ جاتی ہیں۔ سامراجی ملک یہ کوشش کرتے ہیں کہ مقروض ملکوں میں وہی لوگ برسر اقتدار آئیں جو سامراج کے حسب منشا پالیسیوں پر عمل پیرا رہیں۔

سامراجی قرضے حاصل کرنے والے تیسری دنیا کے اکثر ملکوں پر اسی لئے فوجی حکومتیں مسلط ہیں۔ سامراج یہ نہیں چاہتا کہ ان ملکوں میں جمہوری عمل جاری و ساری ہو اور ایسے لوگ برسر اقتدار آئیں جو سامراج دشمن پالیسیاں اختیار کریں مقروض ملکوں میں اگر اتفاقیہ طور پر کوئی محب وطن حکومت قائم ہو جائے تو سامراجی قرض خواہ فوج کے ذریعے اسکا تختہ الٹوا دیتے ہیں۔ انڈونیشیا، چلی اور ایک حد تک بنگلہ دیش اور پاکستان اسی طرح کی مثالیں ہیں آجکل نکاراگوا میں حکومت کا تختہ الٹوانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

مقروض ملک اپنی خارجہ پالیسی کے اعتبار سے سامراج کی عالمی حکمت عملی کا حصہ بننے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ قرضوں کا دباؤ استعمال کر کے انہیں سامراجی ملکوں کے قائم کردہ فوجی معاہدوں میں شامل کر دیا جاتا ہے۔

پاکستان امریکی قرضے ملتے ہی سینٹو اور سیٹو میں دھکیل دیا گیا تھا جس میں ترکی، تھائی لینڈ اور فلپائن وغیرہ دیگر مقروض ملک بھی اکٹھے کر کے چین اور روس کے خلاف کھڑے کر دیئے گئے تھے اس وقت پاکستان افغانستان کی حکومت کے خلاف اسی لئے امریکی حکمت عملی کا حصہ بنا ہوا ہے کہ پاکستان کے حکمران امریکی قرضوں اور دوسرے بندھنوں کے ذریعے امریکی سامراج سے نتھی ہو چکے ہیں۔ قرضوں کا ایک حصہ فوجی سازوسامان خریدنے پر صرف ہوتا ہے۔ خاص طور پر وہ ملک جہاں فوجی حکومتیں قائم ہیں قرض کا اچھا خاصہ حصہ جدید ترین فوجی سازوسامان کی

خریدپر صرف کرتے ہیں ۔ فوجی راہنماؤں کو جدید سے جدید اسلحہ حاصل کرنے کا خبط ہوتا ہے جس کے بعد وہ پڑوس میں واقع کسی چھوٹے ملک پر چڑھائی کر دیتے ہیں یا پھر اپنے ہی ملک کے عوام کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں ۔

قرضے حاصل کرنا کون چاہتا ہے

تیسری دنیا کے ملکوں کے عوام کو سامراجی ملکوں کے قرضوں کا فائدہ نہیں ہوتا تاہم ان ملکوں میں بعض ایسے بااثر حلقے موجود ہیں جو قرضہ حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں ۔ ان عناصر میں فوجی و سول افسر شاہی اور مقامی سرمایہ دار شامل ہیں۔

فوجی اور سول افسر شاہی کو ان قرضوں سے سب سے زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے ۔کیونکہ بالآخر ان قرضوں کو انہی نے خرچ کرنا ہوتا ہے ۔ ان قرضوں کے ذریعے بیرون ملک خریداریاں ہوں یا اندرون ملک ان کا استعمال ، فوجی و سول افسروں کی عید ہو جاتی ہے ۔بیرون ملک خریداریوں پر انہیں کمیشن ملتا ہے جس کی وجہ سے وہ راتوں رات کروڑپتی ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے حاصل کی ہوئی ناجائز کمائی کو ملک سے باہر کاروبار میں لگاتے ہیں یا بینکوں میں محفوظ کر دیتے ہیں ۔ ملک کے اندر ان قرضوں کی وجہ سے مختلف پروجیکٹ چلتے ہیں انکے ٹھیکے دینے میں فوجی و سول افسر شاہی اپنا حصہ وصول کرتی ہے۔

چونکہ ان قرضوں کا ایک حصہ ملکی صنعت میں بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے مقامی سرمایہ دار بھی ان قرضوں سے براہ راست فیضیاب ہوتے ہیں ۔جب ادائیگی کا وقت آتا ہے تو تمام قوم کو یہ قرضہ مع سود اپنے خون پسینے کی کمائی سے واپس لوٹانا پڑتا ہے ۔

پاکستان اور سامراجی قرضے

پاکستان کے حکمرانوں نے ملک کے وجود میں آنے کے جلد ہی

بعد اسے سامراجی ساہو کاروں کے چنگل میں پھنسا دیا تھا، برطانیہ سے آزادی کے وقت امریکی سامراج بھی پاکستان کو اپنے جدید نوآبادیاتی نظام کا حصہ بنانے کے لئے تیار بیٹھا تھا چنانچہ برطانیہ کی براہ راست غلامی ختم ہو جانے کے کچھ بعد ۱۹۵۰ء کی دہائی میں امریکہ کی نئی طرز کی غلامی کا آغاز ہوا اس سلسلے میں سامراجی قرضوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ملک کے حکمران سرمایہ دار، تاجر اور فوجی و سول افسر شاہی سب کے سب قرضوں کے حصول کے خواہشمند تھے جبکہ پاکستان کے جاگیردار جو پہلے برطانوی آقاؤں کے گن گاتے تھے اب حسب فطرت نئے آقاؤں کی تلاش میں تھے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد پاکستان میں امریکی قرضوں کی درآمد شروع ہوئی پہلے چند سال ان قرضوں کی مقدار بہت کم تھی لیکن پاکستان کے پہلے پانچ سالہ منصوبہ ۶۰-۱۹۵۵ء میں ان قرضوں کی مقدار بڑھ گئی۔ پاکستان کی سول افسر شاہی کو امریکہ کی جانب سے طرح طرح کی مراعات کا لالچ دیا گیا، چھوٹے افسروں کو بیرونی سیر و سیاحت اور معمولی تحفے تحائف کافی ثابت ہوتے کچھ افسروں کے بچوں کو غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظائف کا جھانسہ دیا گیا جبکہ اعلیٰ سول و فوجی افسران کو امریکی کمپنیوں کی جانب سے بھاری بھرکم رشوتوں سے نوازا گیا۔ اسی طرح پاکستان منصوبہ بندی کمیشن کے اعلیٰ ارکان کو ملازمت سے ریٹائرڈ ہو جانے کے بعد عالمی بینک و دیگر سامراجی اداروں میں ملازمتوں کے وعدے سے اپنے ساتھ ملایا گیا۔ پاکستان کے سرمایہ داروں کو امریکی قرضوں کی پیشکش ہوئی اور برسر اقتدار سرمایہ دار و جاگیردار طبقات کو یقین دلایا گیا کہ امریکہ ان کی اقتدار پر قابض رہنے میں بھرپور امداد دے گا بشرطیکہ وہ امریکی مفادات کی تکمیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ ملک میں وقتی طور پر گندم کی قلت پیدا ہونے پر یہ خطرہ پیدا ہو رہا تھا کہ حکومت دشمن مظاہرے شدت اختیار نہ کر جائیں چنانچہ امریکی انتظامیہ پاکستان کے حکمرانوں کی امداد کو پہنچی اور آئندہ بھی امداد کا وعدہ کیا۔

پاکستان کو دی جانے والی سامراجی امداد مشروط امداد تھی اس کے واضح سیاسی مقاصد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لیاقت علی خاں کا دورہ روس عین وقت پر منسوخ کر دیا گیا اور اسے امریکہ بھیج دیا گیا یہ وہ زمانہ تھا جب سٹالن کے زیر قیادت سوویت یونین پاکستان کے ساتھ اچھے تعلقات پیدا کرنے کا خواہشمند تھا۔ اور سوویت حکومت ہندوستان سے بدظن تھی امریکی امداد ملنے کے ساتھ ہی "اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے" کا رویہ اپناتے ہوتے پاکستان کو فوجی معاہدوں میں شامل کرنے کا عمل شروع کر دیا گیا جلد ہی پاکستان معاہدہ بغداد (سینٹو) اور سیٹو کا رکن بن گیا یہ دونوں معاہدات چین اور روس کا گھیراؤ کرنے اور اس خطے میں کمیونزم کے اثرات کو روکنے کے لئے وجود میں لائے گئے تھے۔ چنانچہ امریکی امداد کی بدولت پاکستان کو سیاسی طور پر سامراجی غلامی میں دھکیل دیا گیا جس میں ہم آج تک پھنسے ہوتے ہیں۔

امریکی امداد ۱۹۶۵ء تک زور و شور سے جاری رہی لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد امریکی حکومت نے اس امداد میں کچھ عرصہ کے لئے کمی کر دی کیونکہ ایوب حکومت کی بعض پالیسیوں سے امریکی انتظامیہ خوش نہ تھی۔ تاہم کچھ عرصہ کے بعد سامراجی ملکوں نے از سر نو پاکستان پر ساہوکاری نظام کا جال مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ بھٹو کے دورِ حکومت میں چند سالوں کے لئے سامراجی ملکوں پر مکمل انحصار کی پالیسی میں تبدیلی کرتے ہوتے تیسری دنیا کے تیل پیدا کرنے والے ملکوں سے بھی امداد لینے کی کوشش کی گئی گو پاکستان اس دور میں بھی سامراجی جال ہی میں پھنسا رہا تاہم محدود پیمانے پر بھٹو حکومت نے بعض آزادانہ پالیسیاں اختیار کیں۔ مثال کے طور پر امریکی ہدایات کے برعکس بھٹو حکومت نے صنعتوں کو قومیانے کی پالیسی شروع کی گو یہ پالیسی اپناتے ہوئے بھٹو حکومت نے سامراجی سرمائے کو مکمل تحفظ دیا اور کسی بھی سامراجی انڈسٹری کو قومی ملکیت میں نہیں لیا اسی طرح سے بھٹو حکومت نے ایٹم بم بنانے کی تیاریاں شروع کیں یہ

دونوں پالیسیاں امریکی ناراضگی کا باعث نہیں اور امریکی حکومت نے فوجی افسر شاہی کے ذریعے جو امریکہ کے ساتھ نوآبادیاتی رشتوں میں جکڑی ہوتی ہے بھٹو حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

پاکستان میں سامراجی ملکوں سے قرضہ لینے کے حامی ماہرین معیشت مثلاً ڈاکٹر محبوب الحق قرضے کو معاشی ترقی کے لئے لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں ان کا نقطہ نظریہ ہے کہ قرض لے کر ملک میں معاشی انقلاب لایا جا سکتا ہے جس سے پاکستان جنت ارضی میں تبدیل ہو جائے گا ان کا کہنا ہے کہ صنعتی ترقی ہو یا زرعی ترقی سرمائے کے بغیر اس کا حصول ناممکن ہے۔ یہ سرمایہ بقول ان کے پاکستان کے اندر موجود نہیں چنانچہ ملک میں اگر جا بجا فیکٹریاں لگانی ہیں یا سڑکیں، پل اور بند بنانے ہیں، بجلی پیدا کرنی ہے یا کھاد، کیڑے مار دوائیاں اور زرعی مشینری درآمد کرنی ہے تو اس کے لئے سامراجی ملکوں سے قرض لینا ضروری ہے۔

اس نقطہ نظر میں ایک غلطی تو یہ ہے کہ اس کے پیش کرنے والوں کے مطابق پاکستان کے اندر سرمایہ موجود نہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے پاکستان کے اندر سرمایہ موجود ہے۔

اور دوسری جانب یہ چند ہاتھوں میں سمٹا ہوا ہے یعنی یہ ملک کے بڑے سرمایہ داروں بڑے بڑے تاجروں، جاگیرداروں اور سمگلروں کے پاس ہے۔

ملک کی دولت پر قابض یہ چند سو خاندان اس سرمائے کو ملک کی ترقی پر لگانے کی بجائے یا تو اسے سامان تعیش کی درآمد پر ضائع کر دیتے ہیں۔ بیرون ملک سیر و تفریح اور عیاشی میں برباد کر دیتے ہیں، اسے ملک سے باہر برآمد کر کے دوسرے ملکوں میں جائیداد خریدتے ہیں، غیر ملکی بنکوں میں جمع کرتے ہیں یا اس سے باہر کے ملکوں میں کاروبار کرتے ہیں۔

سامراجی استحصال کا خاتمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اگر یہ روپیہ ان چند سو افراد سے

چھین لیا جاتے تو غیر ملکی امداد کی بجائے اسی روپے کو زرعی ترقی، صنعتکاری اور ملک کی عمومی تعمیر میں استعمال کیا جاسکتا ہے اس وقت یہ روپیہ ملک سے باہر خرچ ہو رہا ہے اور اس کے ذریعے امریکہ، جاپان، برطانیہ، جرمنی وغیرہ میں لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع پیدا ہو رہے ہیں جبکہ اگر یہی دولت پاکستان کے اندر موجود رہتی تو اسے سامراجی امداد کی عدم موجودگی میں بھی ملک کی ترقی کی خاطر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ چونکہ پاکستان کی افسر شاہی سامراج کے علاوہ مقامی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ کئے ہوتے ہے اس لئے وہ ترقی کے اس عوامی اور جمہوری طریقے کو اختیار کرنے کی مخالفت کرتی ہے اور سامراجی قرضوں کے حصول کو ضروری قرار دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان ہو یا تیسری دنیا کا کوئی دوسرا ملک بے انتہا امداد لینے کے باوجود وہ اب تک معاشی بدحالی سے نہیں نکل پایا۔ دنیا کے وہ ملک جنہوں نے سب سے زیادہ امداد لی بدحالی کا سامنا کر رہے ہیں۔ برازیل اس وقت تک سو ارب ڈالر سے زیادہ کی امداد لے چکا ہے لیکن اس ملک کا حال یہ ہے کہ یہاں بھوکے لوگوں کے جلوس نکلتے ہیں جو مارکیٹوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں لاوارث بچے ہیں جنہیں غربت کی وجہ سے والدین سڑکوں پر چھوڑ دینے پر مجبور ہوئے وہ سڑکوں ہی میں پل کر جوان ہوئے اور اب ملک میں جگہ جگہ جرائم اور سیاسی ہنگاموں میں پیش پیش ہیں نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ توڑ پھوڑ کی خواہش کو ختم کرنے کے لئے برازیل کی پولیس انہیں ہارمون کے ایسے ٹیکے لگاتی ہے جن سے وہ مردانہ خصوصیات سے محروم ہو جاتے ہیں کئی تیل پیدا کرنے والے ملک بھی سامراجی امداد کے ہاتھوں لٹ چکے ہیں اور ان کی معاشی حالت خراب ہے نائیجیریا اور انڈونیشیا اس کی مثال ہیں۔

خود پاکستان "سامراجی امداد کے ذریعہ ترقی" کے فلسفے کی ناکامی

کی منہ بولتی تصویر ہے پاکستان اس وقت ۱۳ ارب ڈالر کا مقروض ہونے کے باوجود (اصل قرض اس سے زیادہ ہے جس میں سے ۷ ارب ڈالر مع سود ہم ادا کر چکے ہیں) معاشی بد حالی کا شکار ہے۔ آج پاکستان میں معاشی بد حالی کا سیاسی اظہار اس لئے رکا ہوا ہے کہ بیس لاکھ کے قریب پاکستانی کارکن ملک سے باہر کام کر کے پاکستان کو کثیر زر مبادلہ بھیجتے ہیں پاکستانی کارکنوں کا اتنی بڑی تعداد میں باہر چلے جانا ایک تاریخی حادثہ ہے۔ اس طرح کے حادثات ہر روز رونما پزیر نہیں ہوتے۔ ان کارکنوں کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں پاکستانی معیشت جو سامراجی امداد کی بیساکھیوں پر کھڑی کی گئی ہے سخت مشکلات سے دوچار ہونے والی ہے

سامراجی قرضوں کے نقصانات

سامراجی قرضوں کا دور رس نقصان تو یہ ہے کہ ہم اپنی معاشی ترقی کا رخ متعین کرنے میں خود مختار نہیں رہتے۔ ہماری ساری معیشت کو سامراجی مفادات کے تابع کر دیا جاتا ہے سامراجی ملک قطعاً نہیں چاہتے کہ تیسری دنیا کا کوئی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر معاشی طور پر اتنی ترقی کر جائے کہ وہ ان کی منڈی بننے سے انکار کر دے اور اپنا مال اپنی شرائط کے مطابق فروخت کرے وہ تیسری دنیا کے کسی ملک کو بھی معاشی طور پر خود کفیل اور صنعتی طور پر طاقتور ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے وہ تیسری دنیا کے ملکوں میں صرف اس طرح کی انڈسٹری لگانے کی اجازت دے سکتے ہیں جو سامراجی ملکوں کی طفیلی انڈسٹری ہو اور جس کے لئے خام مال اور ٹیکنالوجی سامراجی ملکوں ہی سے درآمد کی جا سکے یہی وجہ ہے کہ سامراجی ملکوں نے پاکستان میں بھاری صنعت لگانے کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۹۷۱ء تک پاکستان میں سٹیل مل نہیں لگنے دی گئی اسی طرح سے مشین سازی کی صنعت

کے قیام میں بھی روڑے اٹکائے گئے پاکستان میں سامراجی ملکوں نے صرف وہ انڈسٹری لگانے کی اجازت دی جس کے ذریعے یہاں سامراجی ملکوں میں پرانی ہو جانے والی ٹیکنالوجی پاکستان کو فروخت کی جا سکے۔ پاکستان میں کثیر القومی سامراجی کمپنیوں کے لئے مراعات حاصل کی گئیں اور پاکستان میں موجود سرمائے کو جو ملکی ترقی میں کام آ سکتا تھا قرضوں کے سود کی شکل میں اور سامراجی کثیر القومی کمپنیوں کے منافعوں کی شکل میں ملک سے باہر کھینچ لیا گیا۔ یہ تھا پہلا نقصان جو سامراجی ملکوں کے قرضوں نے پاکستان کی معیشت کو پہنچایا۔

سامراجی ساہوکار ہماری معیشت کو سرمایہ دارانہ خطوط کے علاوہ کسی اور طریقے سے پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں دیتے وہ نجی ملکیت کو قومی ملکیت میں لینے کی بدترین مخالفت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ضیاء الحق حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد سامراجی آقاؤں کے احکام پر عمل درآمد کرتے ہوئے قومی ملکیت میں لی گئی صنعت کو دوبارہ سرمایہ داروں کو واپس کیا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں ان صنعتوں میں از سر نو پرانے سرمایہ دارانہ ہتھکنڈے شروع ہو گئے ہیں اور مزدوروں کو ان جابرانہ ہتھکنڈوں سے دبایا جا رہا ہے۔

سامراجی قرضوں کے ذریعے فوج کو مضبوط کیا گیا۔ پاکستان کے عوام کے اندر ارد گرد کے ملکوں کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے پاکستان کے عوام کے خون پسینے کی کمائی کو غیر ضروری فوجی اخراجات پر ضائع کر دیا گیا۔ پاکستان میں سڑکیں، پل، ہسپتال اور سکول بنانے کی بجائے اس روپے کو ٹینکوں، ہوائی جہازوں اور توپوں کی خریداری میں صرف کیا گیا جو ہمیشہ پاکستان کے عوام کے خلاف استعمال ہوئیں۔ اس اسلحہ سے پہلے مشرقی پاکستان میں پاکستان ہی کے عوام کا قتل عام کیا گیا پھر بلوچستان میں پاکستان ہی کے عوام کے خون سے ہولی کھیلی گئی ۱۹۸۳ء کی بحالی جمہوریت کی تحریک میں اسے سندھی

عوام کے خلاف استعمال کیا گیا پاکستان میں بار بار فوج نے سول حکومتوں کو برخاست کر کے اپنا اقتدار قائم کیا۔ یہ حکومتیں اس غلط میں امریکی مفادات کی حفاظت کرتے کرتے پاکستان کے عوام کو ان کی تاریخ کے موجودہ خطرناک موڑ پر لے آئی ہیں۔

مندرجہ بالا دیرپا نقصانات کے ساتھ ساتھ ہمیں کئی فوری نقصانات بھی سامراجی امداد کی بنا پر اٹھانا پڑ رہے ہیں گذشتہ چند سالوں میں پاکستان کو امداد دینے والے سامراجی ادارے (عالمی بنک آئی ایم ایف ایشین ڈویلپمنٹ بنک وغیرہ) اپنی شرائط کو سخت سے سخت کرتے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ اگر تیسری دنیا کا کوئی ملک قرضے لوٹانے کے ناقابل ہو گیا اور اس نے قرض واپس کرنے سے انکار کر دیا تو کہیں اس کا اثر باقی مقروض ملکوں پر بھی نہ پڑے۔ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے عوام بھی حکومت کو مجبور کر دیں کہ وہ قرضے لوٹانے سے منکر ہو جائے۔ چنانچہ سامراجی ادارے اس بات کے خواہشمند ہیں کہ جتنی جلدی ہو سکے اپنے قرضے واپس لیں۔ خواہ اس مقصد کے لئے انہیں پاکستان کے عوام کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی کیوں نہ نچوڑنا پڑ جائے ان کی اس پالیسی کے نقصان دہ اثرات جابجا نظر آ رہے ہیں۔ ہم اوپر ۱۹۷۲ء میں سامراجی اداروں کے دباؤ کے تحت روپے کی قیمت میں ۱۳۰٪ کمی کا ذکر کر چکے ہیں۔ اور اس کے بعد فوجی حکومت کے دوران روپے کی قیمت میں مزید کمی کا حوالہ بھی دے چکے ہیں۔ سامراجی ساہوکاروں کے دباؤ کے تحت سبسڈی یا قیمتوں میں چھوٹ کے خاتمے کا بھی مختصراً اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ پاکستان میں گندم اور چینی راشن کے تحت فروخت کی جاتی تھی جس کا مقصد بازار سے کم قیمت پر ان اجناس کا جنہیں ہر شہری استعمال کرتا ہے مہیا کرنا تھا۔ راشننگ کے نظام پر حکومت کو کئی کروڑ روپے خرچ کرنا پڑتے تھے سامراجی ساہوکاروں کے احکام کی تعمیل میں راشننگ کا نظام ختم کر دیا گیا۔

ہے ۔بجلی ، پانی ، اور گیس بھی روزمرہ کے استعمال کی چیزیں ہیں ان کی قیمتوں میں اضافہ ہو چکا ہے ۔ اور سامراجی ساہوکار مزید اضافہ کا مطالبہ کر رہے ہیں ریلوے اور ٹرانسپورٹ کے کرائے بھی مزید بڑھائے اور کھاد اور کرم کش ادویات پر چھوٹ کو مکمل طور پر ختم کرنے پر زور دیا جا رہا ہے ۔ ان اشیاء پر چھوٹ ختم ہو جانے کے نتیجے میں عام آدمی کے روزمرہ کے استعمال کی اشیاء (گندم ، چاول ، سبزیاں ، دالیں ، چینی ، تمباکو وغیرہ) کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا ۔ ان اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کے حق میں سامراجی ساہوکار جو دلیل دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ پاکستان میں ان اشیاء کی قیمتیں عالمی منڈی کے مقابلے میں کم ہیں اور یہ کہ انہیں امریکہ اور برطانیہ وغیرہ میں موجود قیمتوں کی سطح تک لانا چاہئیے ۔ یہ دلیل بے معنی ہے کیونکہ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو قیمتوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مزدوروں ، کلرکوں اور دیگر ملازمت پیشہ لوگوں کی تنخواہوں اور آمدنیوں کو بھی امریکہ اور برطانیہ کی سطح تک لانا چاہیے محض قیمتوں کو عالمی سطح پر لانے اور تنخواہوں کو ویسے ہی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ۔

کیا ہم سامراجی قرض لوٹا سکتے ہیں ۔

ہمارے لئے دراصل سامراجی قرضے واپس کرنا ممکن ہی نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ اب ان قرضوں کا سود اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اس کی قسط واپس کرنے کے لئے ہمیں مزید قرضے لینے پڑتے ہیں ۔ ۱۹۸۵ء تک پاکستان کا ہر فرد ، بچہ ہو یا بوڑھا ۱۶۵۰ روپے کا مقروض ہو چکا تھا ۔

سامراجی قرضوں کے ذریعے ہمارے جسم کے ایک حصے سے خون نکالا جا رہا ہے تو جسم کے دوسرے حصے سے سامراجی کثیر القومی کمپنیاں خون نکال رہی ہیں ۔ ہم زیادہ سے زیادہ پیداوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اسے غیر ملکی منڈی میں فروخت کر سکیں جبکہ سامراجی ملک ہماری مصنوعات

کی قیمتیں بڑھنے نہیں دیتے۔ بقول محبوب الحق کے گذشتہ ۲۷ سال سے اور بقول غلام اسحٰق خان کے گذشتہ ۳۵ سال کے عرصہ کے مقابلے میں ۱۹۸۶ء میں ہماری اجناس کی قیمت سب سے کم ہے (سامراجی صنعتی اشیاء کی قیمتوں کے مقابلہ میں) اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہ ہم کتنی ہی محنت کیوں نہ کریں جب تک ہم جدید نوآبادیاتی نظام کا حصہ بنے رہیں گے ہمیں غیر ملکی تجارت میں خسارہ ہی ہوتا رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیسری دنیا کے اکثر ملک اپنی کل تجارتی آمدنی کا ۱/۲ سے ۳/۴ حصہ قرضوں کی قسطیں واپس کرنے پر خرچ کر رہے ہیں۔

نہ صرف یہ کہ ہماری اجناس کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہونے دیا جاتا بلکہ سامراجی ملک ہماری مصنوعات کی اپنے ملکوں میں درآمد پر پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔ وہ دورخی پالیسی اختیار کرتے ہیں وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم دھڑا دھڑ سامراجی مال درآمد کریں اور ان کی مصنوعات کی درآمد پر کوئی پابندی نہ لگائیں جبکہ وہ خود اپنی صنعت کو "تحفظ" دینے کے نام پر ہماری مصنوعات کو اپنی مارکیٹ میں داخل نہیں ہونے دیتے یا ان کی درآمد کے لئے کوٹہ مقرر کر دیتے ہیں۔

ان حالات میں تیسری دنیا کے ملکوں کے لئے سامراجی قرضے واپس کرنا ممکن نہیں بلکہ یہ ضروری ہوگا کہ وہ سامراجی قرضوں کی واپسی سے انکار کر دیں ہم اب تک ہر طریقے سے ان قرضوں کی وجہ سے بے شمار نقصانات اٹھا چکے ہیں۔ اور اب ضروری ہو گیا ہے کہ یہ مطالبہ کیا جائے کہ سامراجی قرضے ضبط کئے جائیں اور اصل زر یا سود آئندہ اس کی کوئی ادائیگی نہ کی جائے۔

باب ۴

پاکستان کا تجارتی استحصال

تیسری دنیا کے ملکوں کی سامراج کی جانب سے لوٹ کھسوٹ نہ صرف قرضوں کے ذریعے یا کثیر القومی سامراجی کمپنیوں کے ذریعے ہوتی ہے بلکہ تجارتی طریقے سے بھی سامراجی لوٹ کھسوٹ کا عمل تیسری دنیا میں ہر جگہ جاری ہے مغرب کے سامراجی ملکوں نے گذشتہ اڑھائی سو سال کے دوران ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کو ایک طرف خام مال کے ذخائر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تو دوسری جانب اپنی اجناس کے لئے مارکیٹ کے طور پر اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ ان ملکوں کو پسماندہ رکھا جاتے یہاں پر بنیادی صنعتیں نہ لگنے دی جائیں اور انہیں مجبور کر دیا جاتے کہ وہ صرف کپاس گندم، چاول، گنا، کافی، ربڑ، چائے اور خام معدنیات پیدا کرتے رہیں ان سامراجی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پہلے تو طویل عرصہ تک ان ملکوں پر براہِ راست سامراجی قبضہ قائم کئے رکھا اور جب بیسویں صدی میں ان ملکوں نے آزادی حاصل کرنا شروع کی تو مقامی ایجنٹوں کے ذریعے یہ ملک جدید نوآبادیاتی نظام کے شکنجے میں جکڑ دیئے گئے اس وقت سامراجی ملک خود تو صنعتی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں جبکہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ تیسری دنیا کے ملک بدستور خام مال اور معدنیات پیدا کرتے رہیں اگر پٹرول کو خام مال کی فہرست سے خارج کر دیا جاتے تو تیسری دنیا کے ملکوں کی تقریباً ۷۰٪ برآمدات سے ہونے والی آمدنی بنیادی اجناس یعنی خام مال

اور معدنیات سے ہوتی ہے۔[1]

تیسری دنیا کے ملک خام مال اور معدنیات پیدا کرنے میں پیش پیش ہیں۔ یورپ کے اکثر ملک اور جاپان خام مال کی پیداوار میں خود کفیل نہیں ہیں۔ بلکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ سے بنیادی اجناس کی برآمد نہ ہو تو یورپ کے ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں اور جاپان کے لوگوں کے پاس نہ تو کھانے کے لئے کچھ ہو اور نہ پکانے اور پہننے کے لئے، پٹرول اور مٹی کے تیل سے لے کر چائے، کافی، چاول، کپاس تک کی سپلائی بھی تیسری دنیا کے ملک سرمایہ دار ملکوں کو کرتے ہیں۔ بعض بنیادی اجناس کی دنیا کی کل پیداوار اور اس میں تیسری دنیا کے بعض ملکوں کا حصہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان اجناس کی پیداوار میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملک سرفہرست ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ حقائق مندرجہ ذیل ہیں[2]:

چائے : ۱۹۸۲ء

کل عالمی پیداوار	۷ء۲۱۰۸	(ہزار میٹرک ٹن)
بھارت	۹ء۵۶۹	〃
سری لنکا	۱ء۱۸۱	〃
چین	۸ء۱۰۵	〃
افریقہ کے ممالک	۱ء۱۷۲	〃

ربڑ ۱۹۸۳ء

کل عالمی پیداوار	۳۸۸۵	(ہزار میٹرک ٹن)

ملائشیا	۱۵۱۰	(ہزار میٹرک ٹن)
انڈونیشیا	۹۹۰	
تھائی لینڈ	۵۸۵	
بھارت	۱۴۶	
سری لنکا	۱۳۴	

چاول : ۱۹۸۳ء

کل عالمی پیداوار	۴۳۹	(ہزار میٹرک ٹن)
چین	۱۶۳	//
بھارت	۸۵٫۶	//
انڈونیشیا	۳۴٫۳	//
بنگلہ دیش	۲۲٫۵	//
تھائی لینڈ	۱۸	//
برما	۱۳٫۹	//
پاکستان	۵٫۳	//

کافی ۸۴-۱۹۸۳ء

کل عالمی پیداوار	۹۱،۰۵۷	(ہزار ساٹھ کلو کے تھیلے)
برازیل	۳۰،۰۰۰	//
انڈونیشیا	۴،۸۹۵	//
میکسیکو	۴،۲۰۰	//

ایتھوپیا	۳,۲۵۰	(ہزار ساٹھ کلو کے تھیلے)
آئیوری کوسٹ	۳,۶۶۷	"
بھارت	۲,۰۰۰	"
یوگنڈا	۱,۴۰۰	"
کولمبیا	۱,۳۰۰	"

تانبہ : ۱۹۸۲ء

کل عالمی پیداوار	۸۰۴۰	ہزار میٹرک ٹن
چلی	۱,۲۴۱	"
زمبیا	۵۸۴	"
زائرہ	۵۰۳	"

تیسری دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح پاکستان بھی بنیادی زرعی اجناس برآمد کرتا ہے۔ جن میں کپاس اور چاول پیش پیش ہیں۔

تیسری دنیا کے ملکوں کو محض زرعی اجناس اور خام مال پیدا کرنے والے ملک بنانے پر سامراجی ملک صرف اسی لئے اصرار نہیں کرتے کہ ان ملکوں میں یہ اجناس بافراط پائی جاتی ہیں بلکہ وہ اس لئے بھی انہیں صنعتی ملک نہیں بننے دیتے کہ صنعتی اجناس کی قیمتیں عالمی مارکیٹ میں خام مال کے مقابلے میں بہت زیادہ مقرر کی جاتی ہیں۔ گذشتہ چند سالوں میں سرمایہ دار ملکوں کی پیدا کی ہوئی صنعتی اشیاء کی قیمتوں میں باقاعدگی کے ساتھ کئی گنا اضافہ ہوا ہے اس کے برعکس تیسری دنیا کے ملکوں میں پیدا ہونے والے خام مال و زرعی اجناس کی قیمتوں میں باقاعدگی کے ساتھ اضافہ کی بجائے آتار چڑھاؤ رکھا گیا ہے۔ ان ملکوں کی اجناس کی قیمتوں کو یا تو بڑھنے نہیں دیا گیا یا ان میں اضافہ نسبتاً بہت کم ہوا

ہے۔ اپنی قیمتوں میں اضافے اور ہماری اشیاء کی قیمتوں میں کمی یا نسبتاً بہت کم اضافہ کا کام بہت چالاکی کے ساتھ سرانجام دیا گیا ہے اور اس طریقے سے ہمارے سمیت تیسری دنیا کے ملکوں کی تجارتی لوٹ مار کی جا رہی ہے ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیانی عرصے میں تیسری دنیا کی برآمدات کی قیمتوں میں ۶٪ کمی وقوع پذیر ہوئی جبکہ سرمایہ دار ملکوں کی برآمدات کی قیمتوں میں ۱۸٪ اضافہ ہوا۔[۳]

گذشتہ چند سالوں کے دوران بعض اجناس کی قیمتوں میں اضافہ مندرجہ ذیل ہے۔

چائے

سال	قیمت فی پونڈ سینٹوں میں
۱۹۷۶ء	۷۴٫۲ سینٹ
۱۹۷۷ء	۱۴۱٫۱ "
۱۹۷۸ء	۱۱۸٫۸ "
۱۹۷۹ء	۱۰۲٫۳ "
۱۹۸۰ء	۱۰۷٫۱ "
۱۹۸۱ء	۱۰۴٫۰ "
۱۹۸۲ء	۱۰۱٫۵ "
۱۹۸۳ء	۱۲۱٫۷ "

ربڑ

سال	اوسط قیمت فی پونڈ سینٹوں میں

۱۹۷۶ء	۳۹٫۵ سینٹ فی پونڈ
۱۹۷۷ء	۴۱٫۶ 〃 〃
۱۹۷۸ء	۴۹٫۶ 〃 〃
۱۹۷۹ء	۶۵٫۱ 〃 〃
۱۹۸۰ء	۷۳٫۰ 〃 〃
۱۹۸۱ء	۵۷٫۶ 〃 〃
۱۹۸۲ء	۴۵٫۳ 〃 〃
۱۹۸۳ء	۵۶٫۰ 〃 〃

چاول

سال	دو نمبر چاول کی اوسط قیمت ڈالروں میں
۱۹۷۶-۷۷ء	۱۳٫۶ 〃 〃
۱۹۷۷-۷۸ء	۱۸٫۸ 〃 〃
۱۹۷۸-۷۹ء	۱۵٫۳ 〃 〃
۱۹۷۹-۸۰ء	۲۱٫۳ 〃 〃
۱۹۸۰-۸۱ء	۲۵٫۶ 〃 〃
۱۹۸۱-۸۲ء	۱۹٫۳ 〃 〃
۱۹۸۲-۸۳ء	۱۶٫۹ 〃 〃

تانبہ

سال	اوسط قیمت فی پونڈ سینٹوں میں
۱۹۷۶ء	[illegible] 〃 〃

سال	اوسط قیمت فی پونڈ سینٹوں میں		
۱۹۷۷ء	۶۶٫۷۲	〃	〃
۱۹۷۸ء	۶۶٫۵۳	〃	〃
۱۹۷۹ء	۹۲٫۷۵	〃	〃
۱۹۸۰ء	۱۰۲٫۱۹	〃	〃
۱۹۸۱ء	۸۵٫۵۹	〃	〃
۱۹۸۲ء	۷۴٫۵۷	〃	〃
۱۹۸۳	۷۸٫۳۳	〃	〃

کافی

سال	اوسط قیمت فی پونڈ سینٹوں میں	
۱۹۷۶ء	۱۲۲٫۸	سینٹ
۱۹۷۷ء		〃
۱۹۷۸ء	۱۴۸٫۴	〃
۱۹۷۹ء	۱۷۶٫۳	〃
۱۹۸۰ء	۲۰۶٫۶	〃
۱۹۸۱ء	۱۵۹٫۴	〃
۱۹۸۲ء	۱۴۲٫۰	〃
۱۹۸۳	۱۴۰٫۰	〃

مندرجہ بالا چند اجناس کی قیمتوں کا مطالعہ کرنے سے مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں۔

(۱) سرمایہ دار ملکوں کی پیدا کی ہوئی مصنوعات کی قیمتیں گذشتہ دس

سال کے عرصہ میں تین گنا سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہیں (جیسا کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں) جبکہ تیسری دنیا کے ملکوں میں پیدا ہوتے والی اجناس کی قیمتوں میں اضافہ معمولی ہے (ان تمام اجناس کی قیمتیں ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۳ء تک کے عرصہ میں بمشکل ڈیڑھ گنا بڑھی ہیں۔

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سامراجی ملک ایشیاء، افریقہ، لاطینی امریکہ میں پیدا ہونے والی اجناس کی قیمتیں بڑھنے نہیں دیتے۔ جبکہ وہ اپنی اشیاء کی قیمتوں میں بے بہا اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ تیسری دنیا کے ملک معاشی پسماندگی کی بنا پر اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ اپنی پیداوار کو ذخیرہ کر کے منہ مانگی قیمتوں پر فروخت کر سکیں، ایک کسان کی طرح سے وہ فصل پیدا ہوتے ہی اس کے فاضل حصے کو منڈی میں خون چوسنے والے آڑھتیوں کے پاس فروخت کرنے یا اپنی اجناس کو سود خور مہاجنوں کے پاس ان کی مقرر کی ہوئی قیمتوں پر بیچنے پر مجبور ہوتے ہیں تاکہ پچھلے سود کی ادائیگی کریں اور نیا قرض حاصل کر سکیں۔ ظاہر ہے یہ گھاٹے کا سودا ہوتا ہے تیسری دنیا کے غریب ملک اپنی اجناس اونے پونے داموں پر فروخت کرتے ہیں اس کے برعکس سرمایہ دار ملک معاشی طور پر مضبوط ہونے کی بنا پر اپنی اشیاء کا ذخیرہ کر سکتے ہیں اور منہ مانگی قیمتوں پر فروخت کرتے ہیں۔

۲- مندرجہ بالا اعداد و شمار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تیسری دنیا میں پیدا ہوتے والی اجناس اور معدنیات کی قیمتوں میں اضافہ باقاعدگی سے نہیں ہوتا بلکہ سامراجی منڈی کے قوانین کے مطابق ان کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر چائے کی قیمت ۱۹۷۶ء میں ۷۴٫۲ سینٹ سے بڑھ کر یکایک ۱۴۱٫۱ سینٹ ہوگئی لیکن اگلے ہی سال اس کی قیمت میں مندے کا رجحان پیدا ہوا اور یہ کم ہو کر ۱۱۸٫۸ سینٹ پھر اگلے سال ۱۰۲٫۳ سینٹ ہوگئی۔ ۱۹۸۰ء میں اس کی قیمت میں ۵ سینٹ کا اضافہ ہوا لیکن ۸۲-۱۹۸۱ء میں اس کی قیمت گر کر ۱۰۴ سینٹ اور پھر ۱۰۱٫۵ سینٹ ہوگئی۔ ۱۹۸۳ء میں پھر بڑھی اور ۱۲۱٫۷ سینٹ مقرر ہوئی۔ قیمتوں کے اس اتار چڑھاؤ کے

نتیجے میں تیسری دنیا کے ملکوں کی معیشت پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں
ان ملکوں کی معیشت کا انحصار انہی اجناس کی برآمد پر ہوتا ہے۔ قیمتوں
میں غیر یقینی صورت حال ہونے کی بنا پر بعض اوقات پیداوار کرنے والے
ممالک کو نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ وہاں کے کسان یہ سمجھ کر کہ اگلے سال
قیمتیں بڑھیں گی اپنے تمام وسائل، کپاس، چاول یا دیگر اجناس کی پیداوار
پر لگا دیتے ہیں۔ لیکن جب فصل تیار ہو جاتی ہے تو انہیں معلوم ہوتا
ہے کہ عالمی منڈی میں پیداوار کی قیمتیں بڑھنے کی بجائے پچھلے سال کے
مقابلے میں بھی بہت کم کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ وہ برباد ہو جاتے ہیں۔ تیسری
دنیا کے ملکوں کی پیداوار کی قیمتوں میں اچانک کمی بیشی کے نتیجے میں آئندہ
کے لئے منصوبہ بندی کرنی بھی مشکل ہو جاتی ہے۔

تیسری دنیا کی پیداوار کی قیمتوں میں کمی اور سامراجی ملکوں کی مصنوعات
کی قیمتوں میں اضافہ عالمی تجارت کے اعداد و شمار سے بھی ہوتا ہے تیسری
دنیا کے ملک ہر سال اپنی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں وہ ہر سال جو مال
دنیا کی مارکیٹ میں بھیجتے ہیں اس کی مقدار اور قیمت پچھلے سال کے مقابلے
میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن اس مال کی قیمت اسی عالمی مارکیٹ میں
فروخت ہونے والے سامراجی مال کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔
تیسری دنیا کی فروخت اور سامراجی ملکوں کی فروخت کے درمیان فرق
ہر سال بڑھتا چلا جاتا ہے اسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عالمی تجارت میں تیسری دنیا کے
ملکوں کا حصہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے واضح
ہوتا ہے۔

مختلف ملکوں کی کل برآمدات کی مالیت، انکے عالمی برآمدات
میں حصے اور اضافے کی رفتار کا تقابل (۱۶)

برآمدات کی مالیت (ملین ڈالروں میں)

	کل دنیا	سرمایہ دار ملک	تیسری دنیا
١٩٥٠ء	٦٠,٧٠٠	٣٧,٢٠٠	١٨,٥٠٠
١٩٦٠ء	١٢٨,٣٠٠	٨٥,٧٠٠	٢٧,٤٠٠
١٩٧٣ء	٥٧٠,١٠٠	٤٨٨,٣٠٠	٩٩,٤٠٠

کل عالمی برآمدات میں حصّہ

	کل دنیا	سرمایہ دار ملک	تیسری دنیا
١٩٥٠ء	١٠٠	٦١٫٣	٣٠٫٥
١٩٦٠ء	١٠٠	٦٦٫٨	٢١٫٤
١٩٧٣ء	١٠٠	٧١٫٦	١٧٫٤

اضافے کی سالانہ اوسط رفتار

	کل دنیا	سرمایہ دار ملک	تیسری دنیا
١٩٦٠ء — ١٩٧٠ء	٩٫٢	١٠٫٠	٦٫٩
١٩٥٠ء — ١٩٧٠ء	٧٫٤	٨٫٠	٤٫٦

تیسری دنیا کی پیداوار کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کی بابت معمولی اضافے کا نتیجہ تجارتی خسارہ ہوتا ہے ہمیں سرمایہ دار ملکوں کی مصنوعات کی قیمتوں کی شکل میں ہر سال پچھلے سال کے مقابلے میں زیادہ ادائگی کرنی پڑتی ہے زیادہ زرمبادلہ ان کے حوالے کرنا پڑتا ہے جبکہ ان ملکوں کے ساتھ تجارت کے نتیجے میں ہر سال مقابلتاً ہمیں آمدنی کم ہوتی ہے اور تیسری دنیا کے بجٹ کا خسارہ سال بسال بڑھتا چلا جاتا ہے۔

خود پاکستان کو لیں ہم ہر سال تجارتی خسارے برداشت کرنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں اور یہ خسارہ بڑھتا چلا جاتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ پاکستان کے عوام محنت نہیں کرتے یا وہ پیداوار نہیں کرتے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان کا کسان اور کاشتکار ہاڑ کی گرمیاں ہوں یا پوہ کی سردیاں سخت محنت کر کے گذشتہ سال کے مقابلہ میں زیادہ رقبہ زیر کاشت لاتا ہے اور زیادہ پیداوار کرتا ہے وہ ہر سال ملک کی برآمدات میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ لیکن نتیجہ وہی نکلتا ہے، تجارتی خسارہ پچھلے سال کے مقابلے میں بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس کی محنت و مشقت کے نتائج مثبت نکلنے کی بجائے منفی برآمد ہوتے ہیں۔

پاکستان کی برآمدات و درآمدات کے اعداد و شمار سامراج کی تجارتی لوٹ کھسوٹ کی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں مندرجہ ذیل جدول سے اسکا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔[۵]

برآمدات اور درآمدات کی مالیت (ملین روپے)

سال	برآمدات	درآمدات	توازن
۱۹۷۱-۷۲	۳,۳۷۱٫۴	۳,۴۹۵٫۴	- ۱۲۴٫۰
۱۹۷۲-۷۳	۵,۵۵۱٫۲	۸,۳۹۸٫۳	+ ۱۵۲٫۹

سال	برآمدات	درآمدات	توازن
۱۹۷۳-۷۴ء	۱۰،۱۶۱٫۲	۱۳،۴۷۹٫۲	۳،۳۱۸٫۰ –
۱۹۷۴-۷۵ء	۱۰،۲۸۶٫۳	۲۰،۹۲۵٫۰	۱۰،۶۳۸٫۷ –
۱۹۷۵-۷۶ء	۱۱،۲۵۲٫۹	۲۰،۴۶۵٫۳	۹،۲۱۲٫۴ –
۱۹۷۶-۷۷ء	۱۱،۲۹۳٫۹	۲۳،۰۱۲٫۲	۱۱،۷۱۸٫۳ –
۱۹۷۷-۷۸ء	۱۲،۹۸۰٫۴	۲۷،۸۱۴٫۷	۱۴،۸۳۴٫۳ –
۱۹۷۸-۷۹ء	۱۶،۹۲۵٫۰	۳۶،۳۸۸٫۱	۱۹،۴۶۳٫۱ –
۱۹۷۹-۸۰ء	۲۳،۴۱۰٫۱	۴۶،۹۲۹٫۱	۲۵،۵۱۹٫۰ –
۱۹۸۰-۸۱ء	۲۹،۲۷۹٫۵	۵۳،۵۴۳٫۷	۲۴،۲۶۴٫۲ –
۱۹۸۱-۸۲ء	۲۶،۲۶۹٫۹	۵۹،۴۸۱٫۵	۳۳،۲۱۱٫۶ –
۱۹۸۲-۸۳ء	۳۴،۴۴۱٫۷	۶۸،۱۵۰٫۸	۳۳،۷۰۹٫۱ –
۱۹۸۳-۸۴ء	۳۷،۰۳۷٫۱	۷۶،۷۰۶٫۷	۳۹،۶۶۹٫۶ –

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان کی برآمدات میں ہر سال اضافہ ہوا ہے جو ہمارے کسانوں اور کاشتکاروں نیز پاکستان کے مزدوروں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سامراجی ملکوں سے درآمدات کی قیمت میں اضافہ کی رفتار مقابلتاً بہت زیادہ ہے۔ ۷۲-۱۹۷۱ میں ہمیں جو تجارتی خسارہ ہوا وہ ۲۴ ۱۲ بلین روپے کا تھا (ساڑھے بارہ کروڑ روپے) لیکن ۸۴-۱۹۸۳ء میں یہ خسارہ بڑھ کر ۳۹ ارب روپے سے زیادہ ہو گیا۔ یہ صورت حال پاکستان کے لئے مخصوص نہیں بلکہ ساری تیسری دنیا کا یہی حال ہے ہر سال پچھلے سال کے مقابلہ میں زیادہ پیداوار کرو لیکن ہر سال پچھلے سال کے مقابلے میں زیادہ خسارہ برداشت کرو، زیادہ تجارتی نقصان کا سامنا کرو زیادہ سامراجی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنو۔ یہ ہے تیسری دنیا کی صورت حال جو جدید نوآبادیاتی نظام کا حصہ بن جانے والوں کا مقدر بن چکی ہے۔

ہماری اجناس کی قیمتوں میں کمی اور ان کی مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کے نتیجے میں جو صورت حال پیدا ہوئی ہے اسے "تجارتی شرائط میں تبدیلی" (CHANGE IN TERMS OF TRADE) بھی کہتے ہیں۔ ان شرائط تجارت میں فائدے کو مثبت تبدیلی اور نقصان کو معاشیات کی اصطلاح میں منفی تبدیلی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۳ء کے عرصہ میں شرائط تجارت میں تبدیلی کے کوائف مندرجہ ذیل ہیں:[۶]

شرائط تجارت میں تبدیلی (٪)

ملک	۱۹۶۰ء	۱۹۶۵ء	۱۹۷۰ء	۱۹۷۳ء
ترقی یافتہ ممالک	+۶.۶	+۸.۹	+۱۱.۱	+۱۰.۰
تیسری دنیا کے ممالک ماسوائے تیل پیدا کرنے والے ممالک کے	-۱۳.۴	-۱۱.۶	-۱۰.۷	-۱۳.۳

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ سرمایہ دار ملکوں کے لئے تجارتی شرائط ہمیشہ فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں۔ جبکہ یہی تجارتی شرائط تیسری دنیا کے ملکوں کے لئے بتدریج خراب سے خراب تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

خسارے کی صورت میں ہمیں کیا کرنا پڑتا ہے؟ تجارتی خسارے کو پورا کرنے کے لئے تیسری دنیا کے ملک کیا اقدامات عمل میں لانے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں؟ تجارتی خسارہ پورا کرنے کے لئے ہمیں کہا جاتا ہے کہ ہم قرضہ حاصل کریں۔ یعنی پہلے ہمیں خام مال پیدا کرنے والے ملک بننے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ پھر مصنوعی طریقے سے سرمایہ دارانہ چالبازی سے دباؤ

اور دھاندلی سے ہماری اجناس کی قیمتیں کم کردی جاتی ہیں اور ہمیں تجارتی خسارے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے پھر ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس خسارے سے نجات کی ایک ہی شکل ہے کہ ہم سامراجی شرائط پر بین الاقوامی سود خوروں سے قرض حاصل کریں۔

تیسری دنیا کے ملکوں نے آزاد ہونے کے بعد صنعتی ترقی کی کوشش کی ہے۔ انہیں اس سلسلے میں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنے پر مجبور کیا گیا ہے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے روکا گیا ہے۔ بنیادی صنعتیں نہیں لگنے دی گئیں، انہیں سامراج پر انحصار کرنے والی فرسودہ ٹیکنالوجی پر مبنی مصنوعی نام نہاد صنعتی ترقی کا راستہ دکھایا گیا ہے۔ تاہم اس عرصہ میں تیسری دنیا کے جن ملکوں نے کسی قدر صنعتی ترقی حاصل کی ہے، انہیں اپنی صنعتی پیداوار کو بین الاقوامی مارکیٹ میں فروخت کرنے کا اختیار حاصل نہیں۔ سامراجی ملک اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ تیسری دنیا کے ملک اپنی مصنوعی مسخ شدہ صنعتی ترقی کے باوجود اپنی سستی اشیاء ان کے ملکوں میں فروخت کر کے سرمایہ دار ملکوں کی صنعت کو نقصان نہ پہنچا دیں چنانچہ جہاں سامراجی ملک ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم ان کی مصنوعات کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھیں وہاں وہ نت نئی پابندیوں کے ذریعے تیسری دنیا کی مصنوعات کو اپنی منڈیوں میں داخل ہونے سے روکتے ہیں ان میں سے سب سے اہم مثال کپڑے کی مصنوعات کی ہے جن کی درآمد کے لئے امریکہ نے تیسری دنیا کے ملکوں کے لئے ایک محدود کوٹا مقرر کر رکھا ہے اور کوئی بھی ملک اپنے مقررہ کوٹے سے زائد کپڑا امریکی مارکیٹ میں فروخت نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں کی مصنوعات کے لئے سامراجی ملکوں کی مارکیٹ کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ جبکہ سامراجی ملکوں کا ناکارہ گھٹیا اور بیکار مال امداد قرضے اور تجارت کے

نام پر ہم پر لاد دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں تیسری دنیا کے ملکوں کے تجارتی خسارے میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ پاکستان کی کپڑے کی صنعت کے بحران کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری ٹیکسٹائل کی مصنوعات کی فروخت سامراجی ملکوں میں نہیں ہو سکتی جبکہ ہمارے سب سے زیادہ تجارتی رابطے بھی انہی ملکوں کے ساتھ ہیں۔

آج سے کوئی پندرہ سال پہلے تیسری دنیا کی تجارتی زبوں حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک پاکستانی سرمایہ دار نے لکھا تھا "اقوام متحدہ کا دس سالہ دور ارتقاء دس سالہ مایوسی کے دور میں بدل چکا ہے۔ دس سال کے اس عرصہ میں عالمی برآمدات میں ۱۰۱٪ اضافہ ہوا۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں اضافے کی رفتار ۱۱۶٪ تھی تیل کی پیدا وار کرنے والے ملکوں میں تجارتی اضافہ کی رفتار ۷۵٪ تھی اور ترقی پذیر ملکوں میں یہی رفتار ۶٪ تھی" آگے چل کر اس سرمایہ دار نے لکھا "ترقی پذیر ملکوں کے لئے شرائط تجارت کی مسلسل خرابی جو ترقی یافتہ ملکوں کی جانب سے رکاوٹیں پیدا کرنے کا نتیجہ ہے ہمیں ہر سال کم سے کم غیر ملکی زرمبادلہ مہیا کرتی ہیں۔ ہر چند کہ ہمارے خام مال کی پیداوار اور صنعتی مال کی برآمد بڑھتی چلی جاتی ہے"۔ اسی مصنف نے آگے چل کر لکھا، "ترقی پذیر ملکوں اور سامراجی ریاستوں کے درمیان غیر مساوی تبادلے کے نتیجے میں ہمیں جو نقصان ہوتا ہے۔ اسکا تخمینہ ۱۵ بلین ڈالر یعنی برآمدات کا ۵۵٪ اور کل تجارت کا ۲۵٪ لگایا گیا ہے یہ رقم ترقی پذیر ملکوں کو دی جانے والی کل امداد کے مقابلے میں دو گنی ہے اس ناانصافی کا خاتمہ ترقی پذیر ممالک اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی قومی معیشت اور پیداواری قوتوں کو ترقی دیں(۷)"

تیسری دنیا کے اکثر ملک اور پاکستان اپنی تجارت سامراجی ملکوں کے ساتھ نتھی کئے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے حکمران تیسری دنیا کے اکثر

ملکوں کی طرح اپنی قسمت سامراجی ملکوں سے منسلک کئے ہوتے ہیں اور اس بات میں دلچسپی نہیں رکھتے کہ سامراجی ملکوں پر تجارتی انحصار کے نتیجے میں ملک کے عوام کو کتنا نقصان پہنچتا ہے، ملک کی دولت کا کتنا حصّہ سامراج سمیٹ کر لے جاتا ہے اور ہمیں خسارے میں مبتلا کر دیتا ہے ۸۴-۱۹۸۳ کے سال میں پاکستان کی تجارت میں مختلف ملکوں کا حصہ مندرجہ ذیل تھا۔(۸)

ملک (فیصد حصّہ)	درآمدات	برآمدات
جاپان	۱۴٫۳۰	۸٫۷
برطانیہ	۶٫۷	۴٫۴
امریکہ	۱۱٫۴	۸٫۸
اٹلی	۲٫۹	۳٫۵
مغربی جرمنی	۶٫۴	۴٫۸
فرانس	۱٫۹	۲٫۱
چین	۲٫۵	۱٫۷
روس	۰٫۷	۲٫۷
سعودی عرب	۹٫۹	۷٫۹
کویت	۸٫۱	۱٫۹
ایران	۱٫۸	۱۶٫۱
دیگر	۳۳٫۸	۳۶٫۰

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ہماری بیشتر تجارت سامراجی ملکوں کے ساتھ ہے جہاں سے ہم درآمدات زیادہ کرتے ہیں اور برآمدات بہت کم۔ مثلاً صرف چھ سامراجی ملک یعنی (جاپان، برطانیہ امریکہ، اٹلی، مغربی جرمنی اور فرانس) ہماری کل درآمدات کا نصف کے

قریب حصہ (۴۶ء۴۲ ٪) صرف انہی ملکوں سے آتا ہے۔ یعنی ہم درآمدات کا نصف چھ ملکوں سے اور باقی ساری دنیا سے حاصل کرتے ہیں۔ جبکہ یہ ملک ہماری برآمدات کا ایک تہائی سے کم حصہ (۳ء۳۲ ٪) ہم سے خریدتے ہیں اور وہ بھی اپنی من مانی قیمت پر۔ اکیلا ایران ان چھ ملکوں سے نصف حصہ ہم سے خریدتا ہے۔

اگر تجارت کی سامراجی لوٹ کھسوٹ سے آزادی حاصل کرنی ہے تو ایک طرف تو پاکستان اور تیسری دنیا کے ملکوں کو صنعتی ترقی کا راستہ اپنانا پڑے گا جو سامراجی ملکوں پر انحصار کے نتیجے میں نہیں ہو سکتی۔ دوسرے پاکستان کو سامراجی ملکوں پر تجارتی انحصار ختم کرنا پڑے گا اور سوشلسٹ ملکوں نیز تیسری دنیا کے ملکوں کے ساتھ تجارت کو بڑھانا پڑے گا۔ ایسا کئے بغیر ہم تجارتی لوٹ کھسوٹ سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔

حوالہ جات

(۱) "The Weak in the World of the Strong; The Developing Countries in the International System."
R.L.Rothstein, Columbia University Press.
N.Y., صفحہ ۷

(۲) "Commodity year book",
Commodity research bureau, Inc,
N.J.

(۳) دیکھئے صفحہ ۱۳۲ Rothstein 132

(۴) "Trade Barriers Facing Developing Countries" صفحہ ۷۹
Alexander J. Yeats, St.Martings Press, N.Y.

(۵) پاکستان بنیادی حقائق ۸۴-۱۹۸۳ء حکومت پاکستان وزارت مالیات،

(۶) دیکھئے صفحہ ۱۳۲۔ Rothstein

(۷) "Aid & Trade," Yusuf H. Shirazi
Karachi صفحات ۷-۵

(۸) پاکستان بنیادی حقائق ۸۴-۱۹۸۳ء

باب ۵

پاکستان میں سامراجی کثیر القومی کمپنیوں کا کردار

آج کل دنیا کے اخبارات اور ذرائع ابلاغ میں کثیر القومی کمپنیوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ دسمبر ۱۹۸۴ء کو ہندوستان کے شہر بھوپال میں ہزاروں افراد کیڑے مار دوائیوں کی فیکٹری سے گیس نکلنے کی بنا پر ہلاک ہو گئے مرنے والوں کی تعداد ۲ ہزار سے ۸ ہزار تک بتائی گئی۔ جبکہ گیس کے زہریلے اثرات سے متاثر ہونے والے ۲ لاکھ کے قریب تھے۔ یہ کمپنی جس کی لاپرواہی نے ہزاروں افراد کو لقمۂ اجل بنایا امریکہ کی مشہور کثیر القومی کمپنی یونین کاربائیڈ ہے جس کی شاخیں کئی ملکوں میں پھیلی ہوئی ہیں یہ کمپنی پاکستان میں ۵۵۵ کے نام سے سیل فروخت کرتی ہے۔

۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر مصدق کی زیر قیادت ایرانی عوام نے بادشاہ کا تختہ الٹا اور ایرانی تیل کو قومیانے کی کوشش کی۔ ایران کے تیل کے ذخائر پر برطانیہ کی برٹش پٹرولیم کمپنی کا قبضہ تھا چنانچہ اس نے سی آئی اے کی مدد سے ایران میں فوجی بغاوت کرائی اور ڈاکٹر مصدق کو اقتدار سے علیحدہ کر دیا ہزاروں افراد کو گولی مار دی گئی اور ایک بار پھر ایران میں بادشاہت کا نظام رائج ہو گیا۔

۱۹۶۰ء کی دہائی کے آغاز میں کانگو میں یونین مینیر کمپنی (UNION MINIERECOMPANY) نے سامراج دشمن سیاسی اپنما لومبا کا تختہ کرانے کے فوجیوں کے ذریعے الٹایا۔ سامراجی طاقتوں کو خدشہ

تھا کہ لوممبا کی قوم پرستانہ پالیسیوں کی وجہ سے انکے مفادات کو نقصان پہنچے گا اور وہ کانگو میں تانبے کی کانوں سے بے دخل کر دیئے جائیں گے۔

۱۹۷۰ء میں چلی میں آلندے کی سوشلسٹ حکومت برسراقتدار آئی اور اس نے امریکی کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لینا شروع کیا۔ ستمبر ۱۹۷۳ء میں فوجی جرنیلوں نے آلندے کی امریکہ دشمن حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس فوجی بغاوت میں مشہور امریکی کثیرالقومی کمپنی آئی ٹی ٹی کا ہاتھ تھا۔ یہ کمپنی ٹیلی فون سے متعلقہ الیکٹرانک آلات بنانے کے علاوہ کئی کاروبار کرتی ہے۔

کثیرالقومی کمپنیاں کیسے وجود میں آئیں، ان کا عالمی سامراج سے کیا تعلق ہے اور تیسری دنیا کے ملکوں کو بشمول پاکستان کے کس طرح لوٹتی ہیں اس کے بارے میں ہم اگلے چند صفحات میں اظہار خیال کریں گے۔

کثیرالقومی کمپنیاں سامراجی ملکوں کے ان بڑے بڑے دیوہیکل صنعتی و تجارتی اداروں کو کہا جاتا ہے جن کے پاس آج اتنے وسائل جمع ہو چکے ہیں جو اس سے پہلے مصر کے فرعونوں، چین کے شہنشاہوں اور یونان اور روم کے حاکموں کے پاس بھی نہیں ہوتے تھے۔ ان کمپنیوں کے سالانہ منافع دنیا کے اکثر ملکوں کے قومی بجٹوں یا ان کی پورے سال کی پیداوار سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کثیرالقومی کمپنیوں میں سب سے مالدار اور طاقتور کمپنیاں امریکی کمپنیاں ہیں اسکے بعد مغربی یورپ اور جاپان کی کمپنیوں کا نمبر آتا ہے۔

ان کمپنیوں کی طاقت کا اندازہ دنیا کی سب سے بڑی پندرہ[۱۵] کمپنیوں کی ۱۹۸۴ء کی کل بکری (سیل) اور منافع کے اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے[۱]

	کمپنی	ملک	کل بکری	منافع
۱۔	ایکسون	امریکہ	۹۰ ارب ۵ کروڑ ڈالر	۵ ارب ۵۲ کروڑ ڈالر
۲۔	رائل ڈچ شیل	ہالینڈ و برطانیہ	۸۴ ″ ۸۶ ″ ″	۴ ″ ۸۷ ″ ″
۳۔	جنرل موٹرز	امریکہ	۸۳ ″ ۸۸ ″ ″	۴ ″ ۵۱ ″ ″
۴۔	موبل	امریکہ	۵۶ ارب ڈالر	۱ ″ ۲۶ ″ ″
۵۔	فورڈ	امریکہ	۵۲ ″ ۳۱ کروڑ ڈالر	۲ ″ ۹۰ ″ ″
۶۔	برٹش پٹرولیم	برطانیہ	۵۰ ″ ۶۶ ″ ″	۱ ″ ۴۷ ″ ″
۷۔	ٹیکساکو	امریکہ	۴۷ ″ ۳۳ ″ ″	۳ کروڑ ڈالر
۸۔	آئی بی ایم	امریکہ	۴۵ ″ ۹۳ ″ ″	۶ ارب ۵۸ کروڑ ڈالر
۹۔	ای آئی ڈیوپونٹ	″	۳۵ ″ ۹۱ ″ ″	۱ ″ ۴۳ ″ ″
۱۰۔	امریکن ٹیلی فون اینڈ ٹیلیگراف	امریکہ	۳۵ ″ ۱۸ ″ ″	۱ ″ ۳۶ ″ ″
۱۱۔	جنرل الیکٹرک	″	۲۷ ″ ۹۴ ″ ″	۲ ″ ۲۸ ″ ″
۱۲۔	سٹینڈرڈ آئل (انڈیانا)	″	۲۶ ″ ۹۴ ″ ″	۲ ″ ۱۸ ″ ″
۱۳۔	شیورون	″	۲۶ ″ ۷۹ ″ ″	۱ ″ ۵۴ ″ ″
۱۴۔	ای این آئی	اٹلی	۲۵ ″ ۷۹ ″ ″	۵ ″ ″
۱۵۔	اٹلانٹک ریچ فیلڈ	امریکہ	۲۴ ″ ۶۸ ″ ″	۵۶ ″ ″

مندرجہ بالا اعداد و شمار کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لئے ذرا ان کا مقابلہ پاکستان کی کل سالانہ پیداوار اور سارے سال کی برآمدات کے ساتھ کیجئے ۸۴-۱۹۸۳ء میں پاکستان کی کل پیداوار (G.D.P)

۶۴ ارب روپے یعنی سوا چار ارب ڈالر کے قریب تھی بالفاظ دیگر یہ پیداوار پہلی دس کثیر القومی کمپنیوں میں سے جو کمپنی آخری نمبر پر ہے۔ اس کی ۱۹۸۴ء کی کل بکری کے چھٹے حصہ سے بھی کم ہے جبکہ پہلی تین کثیر القومی کمپنیوں میں سے ہر ایک کا سال بھر کا منافع بھی پاکستان کی کل پیداوار سے زیادہ ہے۔

پاکستان کی ۸۴-۱۹۸۳ء کی کل برآمدات کوئی ۲½ ارب ڈالر کے قریب تھیں اس حساب سے ایکسون، رائل ڈچ، جنرل موٹرز، آئی بی ایم اور فورڈ میں سے ہر ایک کا سال بھر کا منافع پاکستان کی سارے سال کی برآمدات سے زیادہ ہے۔

ان کثیر القومی کمپنیوں میں کئی ایک کمپنیاں پاکستان میں بھی موجود ہیں۔ ان میں ایکسون، آئی سی آئی، شیل، جنرل موٹرز، آئی ٹی ٹی، سیمنز پیپسی کولا، کوکا کولا، فلپس، ٹویوٹا، ہنڈا، باٹا، لیور برادرز، ایگفا، کوڈک وغیرہ کے علاوہ مختلف دوا ساز کمپنیاں، بنک اور بڑے ہوٹل شامل ہیں ان کے کردار کے بارے میں ہم آگے بحث کریں گے

کثیر القومی کمپنیاں کیا ہیں؟

کثیر القومی کمپنیاں وہ دیوہیکل کمپنیاں ہیں جو سرمایہ داری نظام کے سامراج میں تبدیل ہونے کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں سرمایہ داری نظام کے ارتقا کے نتیجے میں چھوٹے سرمایہ دار ختم ہوتے چلے جاتے ہیں اور صرف بڑے بڑے سرمایہ دار باقی رہ جاتے ہیں۔ چھوٹے سرمایہ داروں میں سے کچھ تو برباد ہو جاتے ہیں اور کچھ بڑے سرمایہ داروں کے ساتھ کاروبار میں شراکت کر لیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کمپنیوں کو بڑی بڑی کمپنیاں خریدتی چلی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ چند بڑے سرمایہ دار ہر چیز پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اس سے

صنعتی اجارہ داریاں وجود میں آتی ہیں۔ لینن نے اس مسئلے پر اپنی کتاب "سامراج سرمایہ داری کی اعلیٰ ترین منزل" میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

آج کے دور میں سرمایہ دار ملکوں کا سرمایہ بین الاقوامی شکل اختیار کر گیا ہے۔ کئی سرمایہ دار ملکوں کی کمپنیاں اشتراک کر کے ایک بڑی کثیر القومی کمپنی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

کثیر القومی کمپنی سے مراد ایسی کمپنیاں ہیں، جن میں کئی سرمایہ دار ملکوں کے سرمایہ داروں کا روپیہ لگا ہوتا ہے انہیں کثیر القومی کمپنیاں ایک اور وجہ سے بھی کہا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ان کمپنیوں کے پیداواری یونٹ اور فیکٹریاں صرف ایک ملک میں موجود نہیں ہوتے بلکہ بیک وقت بیسیوں ملکوں میں ان کی شاخیں کاروبار کر رہی ہوتی ہیں یا پیداواری عمل میں مصروف ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ کی سٹینڈرڈ آئل کمپنی کی ۱۹۷۰ء کی ابتدا میں ۴۵ ملکوں میں شاخیں تھیں اس کمپنی کے ۵۲٪ ذخائر ملک سے باہر تھے اور یہ تیل کا ۶۸٪ غیر ممالک میں فروخت کرتی تھی۔ فورڈ موٹر کمپنی کی ۱۹۷۰ میں ۲۷ ملکوں میں شاخیں تھیں۔ اسکے ۴۰٪ ذخائر امریکہ سے باہر تھے جبکہ ۳۶٪ مال بھی امریکہ سے باہر مختلف ملکوں میں فروخت کیا جاتا تھا۔ مختلف ملکوں میں یہ کمپنیاں اپنے نام سے بھی کام کرتی ہیں اور بعض اوقات دوسرے ناموں سے بھی۔ مثال کے طور پر بظاہر پاکستان آئل فیلڈز پاکستان پٹرولیم یا پاکستان ٹوبیکو پاکستانی کمپنیاں معلوم ہوتی ہیں لیکن ان میں سے پہلی برطانوی اٹک آئل دوسری برماشیل اور تیسری برٹش امریکن ٹوبیکو کی شاخیں یا ذیلی کمپنیاں ہیں ان میں اکثریتی حصے انہیں کثیر القومی کمپنیوں کے ہیں۔

سامراجی ملکوں کی کثیر القومی کمپنیوں میں قیادتی کردار جیسے کہ اوپر بیان ہوا امریکی کمپنیوں کو حاصل ہے ۱۹۸۴ء میں دنیا کی صف اول کی پندرہ کثیر القومی کمپنیوں میں ۱۲ کمپنیاں امریکی تھیں۔

کثیر القومی کمپنیاں اور سامراجی ملک

کثیر القومی کمپنیاں سامراجی ملکوں کی پالیسیوں کو مکمل طور پر کنٹرول کرتی ہیں وہ امریکی سینٹ اور کانگرس کے انتخابات یہاں تک کہ امریکی صدر کے انتخابات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ امریکہ میں کسی سیاستدان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ان کمپنیوں کو ناراض کر کے انتخابات جیت سکے تمام بڑے امریکی اخبارات حتیٰ کہ بیسیوں ریڈیو اور ٹیلی وژن سٹیشن ان کمپنیوں کے قبضہ میں ہیں اور رائے عامہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، کمپنیاں انتخابات لڑنے والے افراد اور سیاسی جماعتوں کی مالی امداد بھی کرتی ہیں۔ چنانچہ انتخاب جیتنے کے بعد امریکی سیاستدان کثیر القومی کمپنیوں کے احکام پر عمل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

امریکی حکومت کی پالیسی ساز مشاورتی کمیٹیوں میں کثیر القومی کمپنیوں کے نمائندے کثرت سے موجود ہیں ۱۹۷۵ء کے آخر میں امریکی حکومت کی مختلف ایجنسیوں یا کمیٹیوں کی تعداد ۱۳۴۱ تھی۔ جن کے ارکان کی تعداد ۲۴،۰۰۰ تھی ان میں سے نصف تعداد کا تعلق کاروباری لوگوں سے تھا۔ مندرجہ ذیل فہرست ان کثیر القومی کمپنیوں کی ہے جن کے پچاس سے زیادہ ارکان ان حکومتی کمیٹیوں میں شامل تھے[۲]

۱۔ ریڈیو کارپوریشن امریکہ ۹۳ ارکان
۲۔ آئی ٹی ٹی ۶۳ ارکان
۳۔ جنرل الیکٹرک ۷۹ ارکان
۴۔ ایکسون ۷۰ ″
۵۔ ٹیکساکو ۶۷ ″
۶۔ ویسٹنگ ہاؤس ۵۸ ″
۷۔ کولنز ریڈیو ۸۰ ″

ان پالیسی سازاداروں میں موجود کاروباری لوگ نیز کثیر القومی کمپنیوں کے نمائندے حکومت کو اپنی کمپنیوں کے مفادات کی تکمیل کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

امریکہ میں سول سرکاری اہلکار اور فوجی افسر یہ جانتے ہیں کہ دوران ملازمت اگر وہ ان کثیر القومی کمپنیوں کے مفادات کی حفاظت کرتے رہے تو ریٹائر ہونے کے بعد انہیں ان کمپنیوں میں اعلیٰ ملازمتیں مل جائیں گی چنانچہ وہ دوران ملازمت انتہائی وفاداری سے ان کمپنیوں کی خدمت گذاری کرتے رہتے ہیں امریکی کثیر القومی کمپنیاں حکومتی اہل کاروں کو بڑے پیمانے پر رشوت بھی دیتی ہیں۔ اس کی مثالیں ہم آگے پیش کریں گے۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر سامراجی ملکوں کی حکومتیں اور انتظامی شعبے، خارجہ امور کی وزارتیں اور سفارت خانے ان بڑی بڑی کثیر القومی کمپنیوں کے مفادات کی تکمیل میں دن رات جٹے رہتے ہیں ان مفادات میں پیش پیش مفاد تیسری دنیا کے عوام اور وہاں کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ رہے۔

سامراجی ممالک کی کثیر القومی کمپنیوں کے بڑے بڑے بجٹ انکی آمدنی اور منافع افریقہ ایشیا۔ اور لاطینی امریکہ کے عوام کی بے مثال لوٹ کھسوٹ سے حاصل ہوتے ہیں۔

تیسری دنیا اور کثیر القومی کمپنیاں

تیسری دنیا میں کثیر القومی کمپنیاں اس لئے دلچسپی رکھتی ہیں کہ ان ملکوں میں بے پناہ خام مال سستی لیبر اور خریداروں کی بہت بڑی منڈی موجود ہے۔ ۱۹۸۴ء کی سب سے زیادہ بکری کرنے والی پندرہ کمپنیوں میں سے نو کا تعلق پٹرول نکالنے صاف کرنے اور فروخت کرنے سے ہے ایکسون، رائل ڈچ شیل، موبل، برٹش پٹرولیم، ٹیکساکو

سٹینڈرڈ آئل، شیوروں، ای این آئی اور اٹلانٹک رچ فیلڈ) دو کا تعلق موٹر گاڑیوں سے ہے (جنرل موٹرز اور فورڈ) تین کا تعلق الیکٹرونکس آلات اور مشینری سے ہے (آئی بی ایم آئی ٹی ٹی اور جنرل الیکٹرک) اور ایک کا تعلق کیمیکل صنعت سے ہے (ای آئی ڈیوپونٹ)

سامراجی کثیر القومی تیل کی کمپنیوں کا تیسری دنیا سے جو مفاد وابستہ ہے وہ سب پر واضح ہے۔ اسوقت دنیا میں سب سے زیادہ تیل ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ سے نکالا جا رہا ہے۔ تیسری دنیا کے وہ ممالک جو پٹرول کی پیداوار میں پیش پیش ہیں ان میں سعودی عرب، ایران، ملائیشیاء یو اے ای، عراق، انڈونیشیا (ایشیاء)، لیبیا، نائیجریا، الجیریا (افریقہ) اور وینیزویلا، ایکواڈور، میکسیکو اور پیرو (لاطینی امریکہ) شامل ہیں یہ وہ ممالک ہیں جن کے تیل کے وسائل ایکسون، ٹرائی، ڈچ، موبل، برٹش پٹرولیم اور تیل کی دیگر سامراجی کثیر القومی کمپنیوں کو اتنی دولت مہیا کر دیتے ہیں کہ ان کے بجٹ ہماری سالانہ ملکی پیداوار سے بڑھ جاتے ہیں تیل کی کمپنیاں کئی طریقے سے تیل پیدا کرنے والے ملکوں کو لوٹتی ہیں ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) تیل کی دریافت کے مرحلے پر لوٹ کھسوٹ سامراجی کمپنیاں انتہائی مہنگی قیمتوں پر جنہیں منہ مانگی قیمتیں کہا جا سکتا ہے تیل کی کھدائی کے آلات فروخت کرتی ہیں اور جن علاقوں میں کھدائی کا ٹھیکہ لیتی ہیں ان پران کی اجارہ داری تسلیم کی جاتی ہے۔

(ب) تیل کی صفائی کے مرحلے پر یہ کمپنیاں اپنی بے انتہا مہنگی مشینری فاضل پرزہ جات اور انتہائی اونچی تنخواہ پانے والے انجینئروں کے ذریعے متعلقہ ملک کی لوٹ کھسوٹ کرتی ہیں۔

(ج) تیل کی نقل وحمل کے مرحلے پر لوٹ کھسوٹ اس کے بعد آتی

ہے۔ تیل کی نقل وحمل پائپ لائنوں کے ذریعے بھی ہوتی ہے۔ جن کی تعمیر کے دوران میں یہ کمپنیاں بے پناہ منافع کماتی ہیں۔ کیونکہ متعلقہ ٹیکنالوجی پر انہوں نے اپنی اجارہ داری قائم کی ہوتی ہے۔ سمندر کے راستے نقل وحمل کے وسائل پر بھی ان ہی کمپنیوں کی اجارہ داری قائم ہے سمندر کے راستے پٹرول بہت بڑے بحری آئل ٹینکروں کے ذریعے لے جایا جاتا ہے جو ان ہی تیل کی کمپنیوں کی ملکیت ہوتے ہیں۔ یہ کمپنیاں منہ مانگا کرایہ وصول کرتی ہیں۔

(د) تیل کی فروخت کے مرحلے پر بھی یہ کمپنیاں اپنی اجارہ داری قائم رکھتی ہیں۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں ان کمپنیوں نے پٹرول پمپوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ پاکستان میں انکی مثال کالٹیکس، برماشیل اور ایسو وغیرہ کے پٹرول پمپ ہیں۔

مختصر بات کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ پٹرول کی دریافت سے لے کر اسے نکالنے اور پھر اسکی فروخت تک جتنے مرحلے موجود ہیں ان سب پر تیل کی کثیر القومی کمپنیوں نے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے اسکا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ تیل سے حاصل ہونے والے منافع کا بڑا حصہ تیل پیدا کرنے والے ملکوں کو نہیں جاتا بلکہ تیل کی کمپنیوں کو چلا جاتا ہے اب حال یہ ہوگیا ہے کہ کمپنیوں کے منافع تو ہر سال بڑھتے چلے جا رہے ہیں مگر تیل پیدا کرنے والے ملک رفتہ رفتہ دیوالیہ ہو رہے ہیں۔ تیل کی کمپنیوں کے منافع میں اضافے کا اندازہ مندرجہ ذیل گوشوارے سے لگایا جاسکتا ہے (۴)

نام کمپنی	منافع ۱۹۷۳ء	منافع ۱۹۸۳ء	منافع ۱۹۸۴ء
ایکسون	۲ ارب ۴۰ کروڑ ڈالر	۴ ارب ۱۸ کروڑ ڈالر	۵ ارب ۲۰ کروڑ ڈالر

رائل ڈچ	۱ //	۷۸ // //	۳ //	۴۸ // //	۴ // ۸۷ // //
موبل		۸۴ // //	۱ //	۳۸ // //	۱ // ۲۶ // //
برٹش پٹرولیم		۷۶ // //	۱ //	۲۴ // //	۱ // ۴۷ // //

تیل کا اصل منافع تو ان ملکوں کو جانا چاہیئے تھا جہاں سے تیل نکلتا ہے لیکن صورت حال اس کے برعکس ہے خلیج کے ملکوں کو چھوڑ کر تیل پیدا کرنے والے کئی ملک زندہ رہنے کے لیئے قرضوں کے محتاج بن گئے ہیں اور قرضوں کے اس بوجھ میں ہر سال اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے لاطینی امریکہ کے تیل پیدا کرنے والے ملک نائیجیریا، انڈونیشیا سبھی کا یہی حال ہے۔ تیل کی کمپنیاں ان ملکوں کے تیل کی آمدنی سے امیر سے امیر ہوتی چلی جا رہی ہیں جبکہ ان ملکوں کا حال مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

نام ملک	۱۹۸۲ء کا قرض	۱۹۸۲ء میں تیل کی فروخت
پیرو	۱۱ ، ارب ڈالر	۴½ ، کروڑ ڈالر
وینیزویلا	۳۱ ، ارب ڈالر	۱۷ ، ارب ڈالر
الجیریا	۱۵ ، ارب ڈالر	۸½ ، ارب ڈالر
ایکواڈور	۶½ ، ارب ڈالر	۱ ، ارب ڈالر
انڈونیشیا	۲۱ ، ارب ڈالر	۱۳ ، ارب ڈالر
میکسیکو	۸۲ ، ارب ڈالر	۱۶½ ، ارب ڈالر

دنیا کی امیر ترین کثیر القومی کمپنیوں کا دوسرا حصہ مشینری، کل پرزے اور جنگی ساز و سامان پیدا کرتا ہے۔ ان تمام مصنوعات

کی پیداوار کے لئے خام مال کی ضرورت ہے جس میں لوہا، تانبہ، منگنیز ٹائی ٹینیم، پارہ، جست، نکل وغیرہ شامل ہیں۔ اس صنعتی خام مال کے بغیر جنرل موٹرز ہو یا فورڈ، نارتھ روپ ہو یا جنرل ڈائنا مکس کوئی کثیر القومی کمپنی بھی پیداوار نہیں کرسکتی دھاتوں اور صنعتی خام مال کے حصول کے لئے ان کثیر القومی کمپنیوں کو ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ملک دھاتوں سے مالا مال ہیں ان کی لوٹ کھسوٹ سے یہ کمپنیاں ارب پتی بن گئی ہیں لاطینی امریکہ میں جو ملک صنعتی دھاتیں پیدا کرنے میں پیش پیش ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں(۵)

بولیویا: دنیا کا ۱۲٪ ٹین یہاں پیدا ہوتا ہے۔ تانبہ، سکہ، زنک چاندی اس کے علاوہ ہیں

ارجنٹائن: کوئلہ، سکہ، زنک، لوہا، چاندی، تانبا، سونا،

چلی: دنیا کا ۱۲٪ تانبہ یہاں پیدا ہوتا ہے اس کے علاوہ لوہا، کوئلہ، کوبالٹ، زنک منگنیز، سونا، چاندی اور پارہ۔

کولمبیا: دنیا کے ۹۵٪ ہیرے (GEM 'EMERALD) یہاں ملتے ہیں اس کے علاوہ تانبہ، سکہ، پارہ، منگنیز، چاندی، سونا اور پلاٹینم جو سونے سے بھی مہنگی ہوتی ہے۔

ڈومینکن: تانبہ، لوہا، باکسائٹ، سنگِ مرمر، سونا اور چاندی۔

ایکواڈور: تانبہ، لوہا، سکہ اور کوئلہ

گوئٹے مالا: سونا، چاندی، تانبہ، سکہ، لوہا، زنک اور نکل

ہونڈوراس: سونا، چاندی، تانبہ، سکہ، زنک، لوہا، کوئلہ اور سرما

پیرو: تانبہ، یہاں کی کانیں پیداوار کے اعتبار سے دنیا کی اوّلین کانوں میں سے

ہیں۔
دینیز ویلا: سونا، لوہا، تانبہ، کوئلہ، نکل، مینگنیز اور ہیرے۔

افریقہ کے ملکوں کا بھی یہی حال ہے افریقہ کی قیمتی معدنیات پر صدیوں تک یورپی نوآبادکار قابض رہے اب آزادی ملنے کے باوجود افریقہ کے یہ ملک سامراجی کثیر القومی کمپنیوں کی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ ہیں، افریقہ کے جو ملک صنعتی دھاتیں پیدا کرنے میں پیش پیش ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

الجیریا:۔ لوہا، سکہ، پارہ، کوئلہ، تانبہ۔
مصر:۔ لوہا، سونا، جپسم، ٹائی ٹینیم
ایتھوپیا:۔ پلاٹینم، تانبہ، سونا، چاندی، مینگنیز، باکسائٹ، ٹین
جنوبی افریقہ: دنیا میں سونا، ہیرے، سرمہ، پیدا کرنے میں پہلا نمبر ہے اس کے علاوہ پلاٹینم، کروم، تانبہ، یورینیم، وناڈیم، مینگنیز، ایس بیس ٹاس، کوئلہ، اور لوہا پیدا کرنے میں دنیا کے اولین ملکوں میں سے ہے۔
گبون:۔ یورینیم، مینگنیز، لوہا۔
گھانا:۔ ہیرے (دنیا کے اولین ملکوں میں سے ہے) مینگنیز، باکسائٹ۔
لائبیریا:۔ لوہا، سونا، ہیرے۔
گنی:۔ باکسائٹ، لوہا، ہیرے
گنی بساؤ:۔ باکسائٹ
نائیجیریا:۔ ٹین
سیرالیون:۔ ہیرے، لوہا، باکسائٹ۔
یوگنڈا:۔ تانبہ اور ٹین
زائرے:۔ دنیا کا ۷۰ ٪ تانبہ، ۶۳٪ کوبالٹ اور ۴۰٪ صنعتی استعمال کے ہیرے

لاطینی امریکہ اور افریقہ کے ملکوں کے ساتھ ساتھ ایشیاء کے ملک بھی کثیر القومی کمپنیوں کی لوٹ مار کا شکار ہیں۔ ایشیائی ملکوں میں خام مال پیدا کرنے میں مڈل ایسٹ پیش پیش ہے۔ جہاں ایک طرف دنیا کے اہم ترین تیل کی برآمد کرنے والے ملک موجود ہیں۔ ایشیاء میں زرعی اجناس اور قیمتی دھاتیں پیدا کرنے والے ملک بھی ہیں۔ سعودی عرب ایران، عرب امارات، کویت، عراق، انڈونیشیا، یہ سب پٹرول برآمد کرنے والے اہم ملک ہیں جبکہ کئی دوسرے ملک ربڑ، چائے اور کئی دیگر اہم چیزیں پیدا کرتے ہیں۔ ایشیاء میں ٹین، لوہا، مینگنیز، ٹنگسٹن وغیرہ بھی بافراط پائے جاتے ہیں۔

ایشیا کثیر القومی کمپنیوں کے لئے بطور مارکیٹ کے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دنیا کے تمام براعظموں سے آبادی کے لحاظ سے بڑا ہے۔ یہاں پر تین ارب سے زیادہ لوگ رہتے ہیں جو دنیا کی آبادی کا ۵۸٪ ہیں۔ کثیر القومی کمپنیوں کے لئے یہ بہت بڑی مارکیٹ ہے۔

ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں پر سامراجی طاقتوں کی یلغار کا سبب ان ملکوں کی دولت ہے۔ ان ملکوں میں موجود معدنی ذخائر اور زرعی اجناس نے انہیں مغربی اقوام کی حریصانہ نظروں کا نشانہ بنایا ہے۔ اپنی بے پناہ معدنی اور زرعی دولت کی وجہ سے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کو بار بار نوآبادیاتی حملہ آوروں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جنگِ عظیم دوئم کے بعد براہِ راست نوآبادیاتی غلبہ کی جگہ جدید نوآبادیاتی نظام نے لے لی ہے اور اب سامراجی ملک اور ان میں موجود کثیر القومی کمپنیاں تیسری دنیا کے سرمایہ داروں، جاگیرداروں نیز فوجی و سول افسر شاہی کے ذریعے ان ملکوں میں موجود دولت کی لوٹ مار میں مصروف ہیں۔

ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملک تیل کے ذخائر اور دیگر اہم صنعتی معدنیات کے علاوہ زرعی اجناس کی پیداوار میں بھی پیش پیش ہیں اگر سامراجی ملک ان کی لوٹ کھسوٹ نہ کر رہے ہوتے تو تیسری دنیا کے یہ ملک ان قدرتی وسائل کی بنا پر مالا مال ہوتے۔ جو زرعی اجناس یہ ملک پیدا کرتے ہیں۔ ان میں سرفہرست کافی، کوکو، چائے، چاول، گنا تمباکو اور کپاس ہیں تاہم جو ملک یہ اجناس پیدا کرتے ہیں وہ غربت، بیماریوں اور جہالت کا سامنا کر رہے ہیں۔ جبکہ کثیر القومی کمپنیاں جو ان اجناس کی پیکنگ اور خرید و فروخت کرتی ہیں ان کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے

اس بات کا کیا راز ہے کہ معدنیات اور اجناس پیدا کرنے والے ممالک تو فاقہ کشی کا شکار ہیں لیکن ان معدنیات اور اجناس کی خرید و فروخت کرنے والی سامراجی کثیر القومی کمپنیوں کے سالانہ منافعوں میں دن دوگنا اور رات چوگنا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے؟

سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ان کمپنیوں کی عالمی منڈی میں اجارہ داری قائم ہے اور وہ خام مال اور اجناس کی جو قیمت چاہیں مقرر کرا لیتی ہیں تیسری دنیا کے ملکوں کا خون چوس چوس کر سامراج نے انہیں معاشی طور پر اتنا کمزور کر دیا ہے کہ وہ اپنے خام مال اور زرعی اجناس کی ذخیرہ اندوزی کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ انہیں صنعتی ملک بننے نہیں دیا گیا چنانچہ انہیں اپنی پیداوار فوری طور پر عالمی منڈی میں اونے پونے داموں فروخت کرنی پڑتی ہے اس عالمی منڈی پر کثیر القومی کمپنیاں قبضہ کر کے بیٹھی ہوئی ہیں۔ گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں پٹرول کو چھوڑ کر باقی معدنیات اور خام مال کی قیمتیں سامراجی ملکوں کی مصنوعات کی قیمتوں کے مقابلے میں بہت کم بڑھی ہیں بلکہ بعض دفعہ ان کی قیمتوں

میں کمی بھی ہوئی ہے۔ مثلاً ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۶ء کے درمیان خام کافی کی مارکیٹ کی قیمت میں ۲۰ سے ۳۰ فیصد کمی واقعہ ہوئی جبکہ تیار شدہ کافی کی قیمت میں جو سامراجی کمپنیاں فروخت کرتی ہیں دوگنا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں تیسری دنیا کے چار ملکوں نے جو خام تانبہ پیدا کرتے ہیں۔ تانبہ برآمد کرنے والے ملکوں کی کونسل قائم کی (C.I.P.E.C) جسکا مقصد تانبے کی کم از کم قیمت کا تعین کرنا تھا۔ تاہم سودے بازی کی سکت نہ ہونے کی بنا پر یہ ملک اپنے مقصد میں ناکام ہوتے اور قیمت وہی مقرر ہوئی جو سامراجی ملک چاہتے تھے۔ پاکستان ہی کی مثال لیں یہاں پر گذشتہ ۲۰ سال کے عرصہ میں چاول، کپاس، گنا یا خام تمباکو کی قیمتوں میں اضافے کا مقابلہ اگر ان اشیاء کی قیمتوں میں اضافے سے کیا جائے جو صنعتی ملک پیداوار کرتے ہیں تو فرق واضح ہو جائے گا۔

سامراجی کمپنیاں خام مال کی تجارت بھی کرتی ہیں۔ وہ تیسری دنیا کے کسی ملک سے سستا خام مال خرید کر تیسری دنیا ہی کے کسی دوسرے ملک میں مہنگا فروخت کرتی ہیں پاکستان میں موجود سامراجی دواساز کمپنیاں تیسری دنیا کے کئی ملکوں سے اپنی کسی ضمنی کمپنی کی معرفت کوڑیوں کے دام خام مال خریدتی ہیں اور پاکستان میں موجود اپنی کمپنی کے ہاتھوں اسے کئی گنا زیادہ قیمت پر فروخت کرتی ہیں۔ پھر یہ کمپنی اس خام مال سے ادویات تیار کرتی ہے جسکی قیمت پاکستانی عوام کو بلیسیوں گنا زیادہ ادا کرنا پڑتی ہے اسی طرح سے دواساز فیکٹریاں دونوں ہاتھوں سے ایک طرف خام مال پیدا کرنے والے ممالک کی لوٹ کھسوٹ کرتی ہیں تو دوسری جانب پاکستان کی جہاں پر یہ تیار شدہ مہنگی ادویات فروخت کرتی ہیں۔

اب تک صرف پٹرول پیدا کرنے والے ملک ہی اپنے خام مال کی قیمتیں صحیح معنوں میں بڑھوانے میں کامیاب ہو سکے ہیں اس کی وجہ یہ

تھی کہ ان میں سے کئی ملکوں کی آبادی بہت کم تھی جبکہ تیل سے ہونے والی آمدنی بہت زیادہ تھی ان ملکوں کے لئے تیل کی پیداوار کم کرنا ممکن تھا۔

چنانچہ تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی کونسل (OPEC) کے ذریعے یہ ملک اپنے خام مال کی قیمتیں بڑھوانے میں کامیاب ہوگئے تاہم کثیر القومی کمپنیوں کے مقابلے میں ان کی کامیابی جزوی اور عارضی ثابت ہوئی۔ تیل پیدا کرنے والی کمپنیاں جیساکہ اوپر بیان ہو چکا ہے تیل دریافت کرنے، تیل کی ترسیل کرنے اور دنیا بھر میں فروخت کرنے کے سلسلے میں اب بھی اجارہ داری قائم کئے ہوئے ہیں سامراجی ملکوں نے تیل کی قیمتیں کم کرنے کے لئے اپنے جمع شدہ ذخائر کو باہر نکال لیا ہے اور تیل کم استعمال کرنے والی ٹیکنالوجی کو فروغ دیا ہے جسکی وجہ سے تیل کی مانگ میں کمی واقع ہوئی ہے اس کے نتیجے میں تیل کی قیمتیں گر گئی ہیں۔

کثیر القومی کمپنیاں تیسری دنیا کا ایک اور طریقہ سے بھی استحصال کرتی ہیں یہ طریقہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں مزدور طبقے کی بے مثال طریقے سے لوٹ کھسوٹ ہے۔ اسوقت تیسری دنیا کے کئی ملکوں میں جگہ جگہ ان کمپنیوں نے اپنے ذیلی کارخانے قائم کئے ہوئے ہیں اگر یہی کام انہیں سامراجی ملکوں کے مزدوروں سے کرانا پڑتا تو مزدوروں کو بہت زیادہ تنخواہ دینا پڑتی لیکن تیسری دنیا میں مزدوروں کو کئی گنا کم تنخواہ دیکے وہ یہی کام کروالیتی ہیں پاکستان میں تنخواہوں کا تقابل ان تنخواہوں سے کیا جائے جو امریکہ میں صنعتی مزدوروں کو دی جاتی ہیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تیسری دنیا کا کس قدر استحصال کیا جا رہا ہے۔ امریکہ میں صنعتی مزدور کی تنخواہوں کے اعداد و شمار مندرجہ ذیل ہیں[۵]:

سال	ایک گھنٹے کی محنت کا معاوضہ روپوں میں
۱۹۷۷ء	۵۷/ روپے

۱۹۸۳ء -/۱۱۲ روپے تقریباً

ایک ہفتے کی محنت کا معاوضہ روپوں میں

۱۹۷۷ء -/۲,۲۸۱ روپے

۱۹۸۳ء -/۴,۴۸۳ روپے تقریباً

امریکہ کی ایک عام فیکٹری میں کام کرنے والے ایک عام مزدور کی تنخواہ کا پاکستانی مزدور کی تنخواہ سے مقابلہ کریں۔ پاکستان میں مشہور کثیر القومی کمپنی آئی سی آئی گریڈ اے کے مزدور کو زیادہ سے زیادہ ۲۷ سو روپے ماہوار دیتی ہے جبکہ اسی طرح کا مزدور امریکہ میں ۱۸ ہزار روپے ماہوار کے قریب پاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آئی سی آئی (ICI) پاکستان کے مزدوروں کا کس قدر استحصال کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بشتر کثیر القومی کمپنیوں نے تیسری دنیا کے ملکوں میں سستی لیبر سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے کارخانے لگا رکھے ہیں۔ فوکس ویگن کار برازیل اور نائیجریا میں تیار کی جاتی ہے برازیل کا کارخانہ شمالی امریکہ کو کاریں سپلائی کرتا ہے جبکہ نائیجریا کا کارخانہ جنوبی امریکہ اور تیسری دنیا کو کاریں سپلائی کرنے کے لئے بنایا گیا ہے نیڈو دودھ بنانے والی کمپنی نیسلے نے ساری دنیا میں ۳۰۳ فیکٹریاں قائم کر رکھی ہیں اسی طرح سے جرمن دواساز ادارے بائر کی دنیا کے دوسرے ملکوں بشمول تیسری دنیا کے ۳۱۲ شاخیں ہیں۔ یہی حال لیور برادرز، فلپس، آئی سی آئی اور برٹش امریکن ٹوبیکو کمپنی وغیرہ کا ہے۔[۸]

پاکستان میں کثیر القومی کمپنیاں

پاکستان کے قیام کے وقت یہاں پر ایک آدھ کثیر القومی کمپنی کاروبار کر رہی تھی پاکستان قائم ہو جانے کے بعد غیر یقینی صورت حال کے پیش

نظر غیر ملکی سرمایہ داروں نے پاکستان پر کوئی توجہ نہ دی تاہم ایوب خاں کے برسر اقتدار آنے کے بعد کثیر القومی کمپنیوں نے پاکستانی معیشت پر اپنے پنجے گاڑنے شروع کر دیئے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پٹرول، موٹر سازی، کیمیکل، کھاد، ادویات، سگریٹ، خوراک، مشروبات اور روزمرہ کے استعمال کی اشیاء میں کئی ایک کثیر القومی کمپنیاں داخل ہو گئی ہیں اور وہ ان تمام شعبوں میں مقامی صنعتکاروں کو پنپنے کا موقع نہیں دیتیں۔ مندرجہ بالا صنعتی شعبوں کے علاوہ ہوٹل انڈسٹریز میں بھی اور بنکنگ میں بھی عظیم الجثہ، دیوہیکل، کثیر القومی کمپنیاں نمودار ہو گئی ہیں ان میں سے اہم کثیر القومی کمپنیاں مندرجہ ذیل ہیں۔

ایکسون EXXON

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ایکسون (جسے ESSO بھی کہتے ہیں) دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ طاقتور امریکی کثیر القومی کمپنی ہے۔ یہ کمپنی جو ابتداء میں راک فیلر خاندان کے قبضے میں تھی۔ ۱۹۸۴ء میں ۹۰ ارب ڈالر سے زیادہ کا کاروبار کر کے ساڑھے پانچ ارب ڈالر منافع کما چکی ہے دنیا میں موجود سات مشہور تیل کمپنیوں میں (جنہیں "سات بہنیں" بھی کہا جاتا ہے) سرفہرست ہے۔ ایکسون تیل کے علاوہ کیمیکل انڈسٹری نیز کھاد کی پیداوار میں پیش پیش ہے۔ پاکستان میں ایکسون کمپنی نے ڈھرکی (سندھ) کے مقام پر ایکسون کیمیکل لیمٹیڈ کے نام سے کھاد کا کارخانہ قائم کیا ہے پاکستان

میں ایکسون کمپنی کی معاشی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۳ء میں کاروبار کے لحاظ سے پاکستان کی چوٹی کی ستائیس کمپنیوں میں سے ایک کمپنی یہ بھی تھی۔ ان ستائیس کمپنیوں میں سب سے زیادہ اداشدہ سرمایہ اسی کمپنی کا تھا اور ٹیکس سے پہلے منافع کی رقم کے لحاظ سے یہ کمپنی دوسرے

نمبر پر تھی ایجسون کمپنی کا ادا شدہ سرمایہ ۱۰ کروڑ ۸۴ لاکھ روپے تھا۔
ایجسون کمپنی پاکستان میں نہ صرف کھاد پیدا کرتی ہے بلکہ کیڑے مار ادویات بھی پاکستان کی مارکیٹ میں سپلائی کرتی ہے کھاد اور کیڑے مار دوائیوں کی تیاری اور فروخت سے حاصل ہونے والے کئی کروڑ روپے کا منافع کمپنی ملک سے باہر لے جاتی ہے۔

آئی سی آئی

آئی سی آئی برطانوی کثیر القومی کمپنی ہے۔ اس کمپنی نے دیگر کثیر القومی کمپنیوں کے مقابلے میں پاکستان میں اس وقت سب سے زیادہ سرمایہ کاری کی ہوئی ہے۔
آئی سی آئی ۱۹۸۵ء میں مجلہ " فورچون" میگزین میں چھپنے والی فہرست کے مطابق دنیا کی سب سے اوپر کی کثیر القومی کمپنیوں میں اڑتالیسویں نمبر پر تھی۔ ۱۹۸۴ء میں اس کمپنی کی کل فروخت ۱۳ ارب ڈالر کے قریب تھی۔ (۱۳،۲۸۴،۴۵۵،۰۰۰ ڈالر) جبکہ اسکا سالانہ منافع ۸۰ کروڑ ڈالر سے تھوڑا کم تھا (۷۸۱،۳۰۷،۰۰۰ ڈالر)
آئی سی آئی پاکستان میں چار مختلف طرح کے کام کر رہی ہے کھیوڑہ کے مقام پر کمپنی نے سوڈا ایش فیکٹری قائم کی ہے جہاں کاسٹک سوڈا تیار ہوتا ہے۔ شیخوپورہ کے قریب پولی ایسٹر کی فیکٹری قائم کی ہے جو پولیسٹر تیار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ پینٹس کے نام سے یہ کمپنی رنگ سازی کی صنعت میں داخل ہوگئی ہے کمپنی اس کے علاوہ کیمیکل کی درآمد کا کام بھی کرتی ہے۔
آئی سی آئی پاکستان مینوفیکچررز لمیٹڈ کے نام سے قائم ہونے والی یہ کمپنی ایک اور رنالیاتی دیو ہے۔ کمپنی کا ادا شدہ سرمایہ ۱۹۸۵ء میں ۲۶ کروڑ روپے سے زائد ہے جبکہ ۵۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی اجازت ہے۔ ۱۹۸۵ء کے سال میں کمپنی نے ۱۸ کروڑ کا قابل ٹیکس اور ۱۳ کروڑ ۸۸ لاکھ روپے

کا بعد از ٹیکس منافع کمایا۔ یہ کمپنی اپنے سرمائے کے لحاظ سے اس قدر مضبوط ہے کہ کسی چھوٹے موٹے پاکستانی سرمایہ دار کے لئے اس کے مقابلے میں پولی الیسٹر یا کاسٹک سوڈا میں صنعت کاری کرنا ممکن نہیں۔

اس وقت کچھ مقامی صنعتی یونٹ بھی سوڈا ایش پیدا کرتے ہیں لیکن آئی سی آئی کے مارکیٹ میں داخل ہو جانے کے بعد ان یونٹوں کی حالت پتلی ہو رہی ہے۔ مثلاً اتحاد کیمیکل بھی سوڈا ایش پیدا کرتا ہے مگر اپنی پرانی مشینری، نیز مہنگی سوڈا ایش بنانے کی پروسس کی بنا پر آئی۔ سی۔ آئی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ قومی سیکٹر میں لگایا جانے والا سوڈا ایش کا پلانٹ بھی آئی سی آئی کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کر رہا ہے۔ یہی حال آئی سی۔ آئی کی پولی الیسٹر کا کارخانہ لگ جانے کے بعد مقامی صنعت کا ہوا ہے۔ راوی ریان کے لئے آئی سی آئی پولی الیسٹر کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں رہا مقامی مارکیٹ سکڑ گئی ہے اور پہننے والے کپڑے کی مارکیٹ میں زیادہ تر آئی سی آئی کی پولی الیسٹر کا قبضہ ہو گیا ہے۔

آئی سی آئی نے پاکستان میں پولی الیسٹر کا جو کارخانہ لگایا ہے۔ اسکے ذریعے ملک میں ملازمتوں میں قابل ذکر تعداد میں اضافہ نہیں ہوا۔ کروڑوں روپے کی سرمایہ کاری کرنے کے باوجود یہ کمپنی صرف چند سو پاکستانی مزدوروں کو روزگار مہیا کرسکی ہے۔ نہ ہی اس کارخانے کے ذریعے جدید ٹیکنالوجی پاکستان میں منتقل ہوئی ہے بنا بنایا پولی الیسٹر فلیکس کی شکل میں کمپنی اپنے بیرون ملک کارخانوں سے بین الاقوامی قیمتوں سے کئی گنا زیادہ قیمت پر درآمد کر لیتی ہے۔ اصل ٹیکنالوجی پٹرول سے ان فلیکس کے تیار کرنے میں درکار ہوتی ہے۔ پاکستانی کارکنوں کو اس ٹیکنالوجی کے قریب نہیں آنے دیا جاتا۔ کمپنی اسے خفیہ رکھتی ہے فلیکس سے ریان بنانے کا کام ایک طرح کی بنائی (WEAVING) کا کام ہے جس میں ٹیکنالوجی کا استعمال اہمیت نہیں رکھتا

اور اس سے مقامی کارکنوں کی مہارت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ پاکستان میں پولی ایسٹر فی الحقیقت تیار نہیں ہوتا۔ آئی سی آئی کا پاکستان میں موجود کارخانہ اسی طرح سے پولی ایسٹر تیار کرتا ہے۔ جیسے موٹر سائیکل کو مقامی طور پر مڈگارڈ لگا کر دعویٰ کیا جائے کہ پاکستان میں موٹر سائیکل بنایا جا رہا ہے

لیور برادرز (LEVER BROTHERS)

لیور برادرز اس خطے میں انگریزوں کے زمانے سے موجود ہے اور پاکستان میں موجود کثیر القومی کمپنیوں میں ایک اہم کمپنی ہے۔ پاکستان کے علاوہ یہ کمپنی ہندوستان نائجیریا، زائر، کانگو، چلی اور کئی دوسرے ایشیائی افریقی، اور لاطینی امریکی ملکوں میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ یورپ اور امریکہ میں بھی موجود ہے۔

لیور برادرز خود ایک کثیر القومی کمپنی یونی لیور کا حصہ ہے جو یورپ کی دوسری بڑی کمپنی ہے۔ رسالہ "فورچون" کی ۱۹۸۵ء کی بڑی کمپنیوں کی فہرست کے مطابق یہ کمپنی اٹھارویں نمبر پر تھی ۱۹۸۴ء میں اس کی کل فروخت ۲۱ ارب ڈالر سے زیادہ تھی۔ (۲۱,۱۵۸,۷۹۰,۰۰۰ ڈالر) جبکہ اسکا سالانہ منافع ۶۳ کروڑ ڈالر سے زیادہ تھا۔
(۶۳۷,۰۶۵,۰۰۰ ڈالر)

پاکستان میں ۱۹۸۴ء میں لیور برادرز کا ادا شدہ سرمایہ ۹ کروڑ ۸۹ لاکھ ۲۱ ہزار روپے تھا جبکہ اسے یہاں ۲۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی اجازت تھی ۱۹۸۴ ہی میں کمپنی کا سال بھر کا بعد از ٹیکس منافع ۲ کروڑ ۸۹ لاکھ ۴۷ ہزار روپے تھا۔ ۱۹۸۵ میں صرف چائے سے ہونے والا منافع پونے دو کروڑ روپے کے قریب تھا جبکہ گھیوں سے ایک کروڑ کے قریب منافع ہوا۔[10]

لیور برادرز پاکستان میں خورد و نوش اور روزمرہ کے استعمال کی اشیاء پیدا کرتی ہے عرصہ دراز سے لیور برادرز ڈالڈا کے نام سے بناسپتی گھی پیدا کر رہی اور اس کی پبلسٹی اتنے زور شور سے کی گئی ہے کہ روزمرہ کی زبان میں ڈالڈا کا مطلب ہی بناسپتی گھی بن گیا ہے۔

لیور برادرز کی فیکٹری پنجاب میں رحیم یار خاں کے مقام پر قائم ہے۔ جہاں ڈالڈا تیار کیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ کمپنی صابن بناتی ہے اس کے تین صابن وسیع پبلسٹی کی بنا پر ہر جگہ مشہور ہیں۔ یعنی لائف بوائے سن لائٹ اور لکس۔ لکس کھاتے پیتے لوگوں کے لئے ہے لائف بوائے نچلے درمیانے طبقے کے لئے اور سن لائٹ نچلے طبقے کے لوگوں کے لئے ہے۔

باالفاظ دیگر لیور برادرز پاکستان کے تمام طبقات کی جیبیں خالی کراتی ہے۔ سن سلک شیمپو بھی لیور برادرز بناتی ہے کپڑے دھونے والا پاؤڈر سرف، گبز (GIBBS) نام کی تین قسم کی شیونگ کریم، کلوزاپ اور سگنل نام کے دو ٹوتھ پیسٹ، بلو بینڈ اور ماسٹر لائن کے نام کی مکھن کی جگہ لینے والی مارجرین سبھی لیور برادرز کی پیداوار ہیں۔ لپٹن کمپنی بھی لیور برادرز نے خرید لی ہے۔ کھجوروں کی پیکنگ اور ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کیا ہے اور ٹھٹھہ ضلع میں ساحل سمندر پر جھینگا مچھلی (ٹائیگر پران) پالنے کا فارم بھی بنایا ہے۔

لیور برادرز نے کاروبار میں اتنے پاؤں پھیلا دیتے ہیں کہ پاکستان میں بسنے والے ہر شہری کو کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی شے اس کمپنی سے خریدنی پڑتی ہے۔

لیور برادرز نے پاکستان کے مشہور ۲۲ صنعتی خاندانوں میں سے ایک خاندان کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کئے ہوئے ہیں۔ بیکجز لمیٹڈ کا سید بابر علی لیور برادرز کا بھی ڈائریکٹر ہے۔

کثیر القومی کمپنیاں ویسے تو کئی طرح کے کاروبار کر رہی ہیں۔ ہم خاص طور

پر دو شعبوں کا ذکر کرنا چاہیں گے۔ جہاں انہوں نے پاکستانی صنعتکاروں کو قریب قریب ختم کردیا ہے ان میں سے ایک شعبہ سگریٹ انڈسٹری ہے اور دوسرا شعبہ ادویات سازی کی انڈسٹری ہے۔

پاکستان کی سگریٹ سازی کی انڈسٹری اور کثیر القومی کمپنیاں

کے وجود میں آتے ہی قائم ہونا شروع ہوگئی
سگریٹ انڈسٹری پاکستان کی ابتدائی صنعتوں میں سے ہے۔ اس وقت پاکستان میں بظاہر ۸ تمباکو کمپنیاں ہیں جنہوں نے ۲۱ یونٹ قائم کئے ہوئے ہیں تاہم ۸۰ فیصد سے زیادہ کاروبار صرف تین کثیر القومی کمپنیوں کے قبضے میں ہے۔
پاکستان میں موجود کثیر القومی کمپنیوں میں پیش پیش برٹش امریکن ٹوبیکو (BAT) ہے۔ یہ کمپنی پاکستان میں، پاکستان ٹوبیکو کمپنی کے نام سے کام کرتی ہے اسکے قبضے میں پاکستان ٹوبیکو کمپنی کے حصص کا ۶۳٪ حصہ ہے۔ کمپنی گولڈ لیف، ولز، گولڈ فلیک، کیپسٹن، ایمبیسی، قینچی اور ریڈ لیمپ کے مقبول عام سگریٹ تیار کرتی ہے۔ جو اوپر سے لیکر نیچے تک تمام طبقات کے استعمال میں آتے ہیں۔

برٹش امریکن ٹوبیکو دنیا کا سب سے بڑا سگریٹ ساز ادارہ ہے۔ اس کے پاس دنیا کی سگریٹ کی تجارت کا ۲۰٪ حصہ ہے۔ پاکستان میں سگریٹ کی کل فروخت کا ۳۸.۵۳ فیصد حصہ ۱۹۸۴ء میں اس کمپنی کے پاس تھا اس کی ۱۹۸۴ء کی عالمی فروخت ساڑھے تیرہ ارب ڈالر کے قریب (۱۳,۴۶۱,۸۰ ڈالر) اور منافع ۱۳ کروڑ ڈالر (۱۳۲,۵۷۱,۰۰ ڈالر) تھا۔ سگریٹ کی انڈسٹری میں عالمی سطح پر دوسرا بڑا نام فلپ موریس کا ہے جس کے قبضے میں دنیا کی ۱۶٪ سگریٹ کی تجارت ہے۔ فلپ موریس نے ۱۹۶۵ء میں مشہور امریکی فرم جنرل فوڈز کو بھی خرید لیا تھا جو میکس ول

ہاؤس کافی فروخت کرتی ہے۔

پاکستان میں پریمئیر ٹوبیکو انڈسٹریز کے ۹۴٪ حصص فلپ موریس کمپنی کے قبضے میں ہیں۔ پریمیر ٹوبیکو کے۔ لوڈ کے علاوہ فلپ موریس کا مشہور برانڈ مارل برو بھی بناتی ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا سگریٹ تصور کیا جاتا ہے۔ سیون اپ نام کا مشہور مشروب بھی فلپ موریس کمپنی ہی تیار کرتی ہے۔

۱۹۸۴ء میں اس کثیر القومی کمپنی کے پاس پاکستان کی سگریٹ کی مارکیٹ کا ۱۸ء۲۲ فیصد حصہ تھا۔

لیکن لوڈ بیکو تیسری اہم سگریٹ ساز کمپنی ہے یہ کمپنی اس وقت پاکستان میں ۵ء۱۹ فیصد سگریٹ کے کاروبار پر قابض ہے۔

پاکستان میں کثیر القومی سگریٹ ساز ادارے کروڑوں روپے سالانہ کماتے ہیں۔ پاکستان ٹوبیکو کا ۱۹۸۵ء میں بعد از ٹیکس منافع ۳ کروڑ ۴۱ لاکھ روپے تھا جبکہ پریمئیر ٹوبیکو کا قبل از ٹیکس منافع ۳ کروڑ ۷۴ لاکھ روپے تھا۔ نہ صرف یہ کہ پاکستان کی سگریٹ کی ۸۰٪ سے زیادہ مارکیٹ تین کثیر القومی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے بلکہ خیبر ٹوبیکو کمپنی کے حصے کا ۳۰٪ حصص پاکستان ٹوبیکو کمپنی کے قبضے میں ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کمپنی کے منافع کا بھی ایک حصہ (جو پاکستان کی چوتھی بڑی سگریٹ ساز کمپنی ہے) ملک سے باہر چلا جاتا ہے[۱۱]۔

سگریٹ سازی کی صنعت میں کثیر القومی کمپنیوں نے یلغار کی ہوئی ہے ان کے پاس سرمایہ اتنا ہے کہ پاکستانی کمپنیوں کے لئے ان کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔

کثیر القومی کمپنیاں ٹیلیویژن اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے کروڑوں روپے کی رقم پبلسٹی پر خرچ کر سکتی ہیں جو پاکستانی کمپنیوں کے لئے ممکن نہیں۔

ملک میں ایک طرف سگریٹ نوشی کے خلاف
مہم جاری ہے تو دوسری طرف سگریٹوں کی قیمتیں عام آدمی کی پہنچ سے
باہر ہوتی جارہی ہیں۔ ان دونوں اسباب کے نتیجے میں سگریٹ کی
مانگ میں کمی واقع ہورہی ہے جبکا سب سے زیادہ اثر ان مقامی کمپنیوں
پر پڑرہا ہے جو کم سرمائے کی بنا پر پبلسٹی نہیں کرسکتیں یا اخراجات میں کمی
پیدا کرکے سگریٹ کی قیمت نیچے نہیں لاسکتیں۔ کثیر القومی کمپنیوں کے
مقابلے میں مقامی سگریٹ سازاداروں کو کوئی تحفظ حاصل نہیں پاکستان
کا مقامی صنعتکار نچلے برانڈ کے سگریٹ پیدا کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے
کیونکہ اس کے اتنے وسائل نہیں کہ وہ
اعلیٰ برانڈ کے سگریٹ پیدا کرکے بڑی کمپنیوں کا مقابلہ کرسکے
تاہم کثیر القومی کمپنیاں اسے نچلے برانڈ کے سگریٹ کے کاروبار
سے بھی بیدخل کرنے پر تلی بیٹھی ہیں چنانچہ وہ بھی نت نئے ناموں سے
نچلے برانڈ کے سگریٹ مارکیٹ میں لارہی ہیں مثلاً پاکستان ٹوبیکو کمپنی ایمبی
سگریٹ اور لیکسن ٹوبیکو کمپنی پیشاما سگریٹ کم قیمت کے برانڈوں کے
طور پر فروخت کررہی ہے۔
حال ہی میں حکومت نے سگریٹ انڈسٹری کے پھیلاؤ پر
بعض پابندیاں عائد کی ہیں یعنی وہ فیکٹری کو بڑھانے کے سلسلے میں روپیہ
خرچ نہیں کرسکتیں۔ لیکن بقول بابر ایاز[۱۲۸] کثیر القومی کمپنیاں مختلف حیلوں
بہانوں سے اس پابندی کو توڑ رہی ہیں۔ مثلاً حال ہی میں پاکستان ٹوبیکو
کمپنی کو اس کی مادر کمپنی برٹش امریکن ٹوبیکو نے ۹۵ لاکھ روپے کی
مشینری بطور عطیہ دی ہے۔ بابر ایاز کے کہنے کے مطابق سگریٹ کی
کثیر القومی کمپنیوں کے ذیلی اداروں کو مقامی صنعتکاروں پر مندرجہ ذیل
لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔

۱۔ چونکہ کثیر القومی کمپنیاں بے انتہا منافع کما رہی ہیں اس لئے ان کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنے مقبول درمیانے درجے کے برانڈوں کی قیمتیں کم کر دیں اور اس طرح سے انہیں سب سے نچلے درجے کے سگریٹوں کے زمرے میں لے آئیں جن پر ایکسائز ڈیوٹی سب سے کم ہے۔

۲۔ چونکہ کثیر القومی کمپنیوں کے پاس فیکٹری کے اندر فلٹر سازی کی سہولت موجود ہے اس لئے وہ اپنے سب سے کم قیمت سگریٹوں پر بھی فلٹر لگا سکتے ہیں ایسا کرنا مقامی صنعتکاروں کے لئے ممکن نہیں۔

۳۔ کثیر القومی کمپنیوں کے پاس منافع بھی بہت زیادہ ہے اور سرمایہ بھی زیادہ چنانچہ وہ سگریٹ کے خوردہ فروشوں کو مقابلتاً زیادہ مراعات دے سکتے ہیں۔

۴۔ کثیر القومی کمپنیوں کے سگریٹ چونکہ ساری دنیا میں فروخت ہوتے ہیں اس لئے وہ باہر کے ملکوں میں تیار ہونے والی پبلسٹی کا سامان با آسانی پاکستان لا سکتے ہیں (ٹی وی اشتہاری فلمیں وغیرہ)

۵۔ کثیر القومی کمپنیاں جدید ترین مشینری پر بہت زیادہ تعداد میں سگریٹ تیار کرتی ہیں جبکہ مقامی صنعتکاروں کو نسبتاً پرانی مشینری پر اور کم تعداد میں سگریٹ تیار کرنا ہوتا ہے اس لئے مقامی صنعتکار زیادہ لاگت کی مار کھا جاتا ہے۔

۶۔ کثیر القومی کمپنیاں اعلیٰ اقسام کا تمباکو استعمال کرتی ہیں جس کی قیمت میں اتنا اضافہ نہیں ہوتا۔ جبکہ مقامی کمپنیاں جو تمباکو استعمال کرتی ہیں ان کی قیمت میں مقابلتاً بہت اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ کثیر القومی کمپنیوں کے لئے ممکن ہے کہ وہ درمیانی کوالٹی کے سگریٹ کم قیمت پر فروخت کریں۔

ان حالات میں پاکستان کا مقامی سگریٹ بنانے والا صنعتکار جو

پہلے ہی کل مارکیٹ کے صرف ۲۰٪ حصے پر قابض ہے رفتہ رفتہ اس حصے سے بھی دست بردار ہو جانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ بحیثیت اپنے ملک میں اس کے لئے روزگار کمانا مشکل کر دیا گیا ہے، جبکہ باہر سے آئے ہوئے اداروں کو ہر قسم کی مراعات دی جا رہی ہیں۔

پاکستان کی دواسازی کی صنعت پر کثیر القومی کمپنیوں کا کنٹرول

سگریٹ انڈسٹری کی طرح دواسازی کی صنعت پر بھی غیر ملکی ادارے مکمل طور پر چھا چکے ہیں۔ یہ دواساز ادارے اکثر و بیشتر ایوب خاں کے دور میں قائم ہوئے اور کچھ اس دور کے بعد موجودہ مارشل لا دور میں۔

پاکستان میں گذشتہ چند سالوں میں دواسازی کے کاروبار کو بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے ۱۹۷۱-۸۱ کے درمیان دس سال میں دوائیوں کی فروخت میں دس گنا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان میں دوائیوں کی کل فروخت ۴۰ کروڑ روپے تھی جبکہ ۱۹۸۱ء میں دوائیوں کی کل فروخت ۴ ارب روپے کے لگ بھگ ہو گئی بالفاظ دیگر دس سال کے اس عرصے میں فروخت میں ۲۵٪ اضافہ ہوا تاہم اس اضافے سے فائدہ اٹھانے والے زیادہ تر غیر ملکی صنعتکار ہیں ۱۹۸۵ء میں ۲۰۶ دواساز یونٹوں سے ۷۰٪ یونٹ صرف پندرہ کثیر القومی کمپنیوں کے کنٹرول میں ہیں[۱۴]۔ جن میں وائتھ، گلیکسو، سینڈوز، پارک ڈیوس، بائر، اسپرو نکلس، ہائیکسٹ، ویلکم، ریکٹ اینڈ کالمین، فائزر وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مالی اعتبار سے اتنی بڑی کمپنیاں ہیں کہ ان کا مقابلہ کرنے کا تصور کوئی پاکستانی ادارہ نہیں کر سکتا مثلاً رسالہ "فوربیون" کی ۱۹۸۵ء کی لسٹ کے مطابق جرمن دواساز کمپنی بائر کی ۱۹۸۴ء کی کل فروخت پندرہ ارب (۱۵،۰۸۰،۱۸،۰۰۰) ڈالر تھی جبکہ اسکا سالانہ منافع ۳۵ کروڑ ڈالر سے زیادہ تھا (۳۵۴،۴۷۰،۰۰۰ ڈالر) پاکستانی دواساز اداروں

کے تمام اثاثوں کو جمع کر لیا جائے تو بائر کا سال بھر کا منافع اس سے زیادہ ہوگا۔ بائر کمپنی ۱۹۸۴ء میں دنیا کی بڑی کمپنیوں میں سے چھتیسویں نمبر پر تھی یہ کمپنی عام دوائیوں کے علاوہ کیڑے مار ادویات بھی فروخت کرتی ہے۔ اور اگفا نامی فوٹو گرافی کا سامان بنانے والی فرم پر بھی اس کی ملکیت ہے۔ اسی طرح سے ہائیکسٹ نامی جرمن دواساز فرم کی ۱۹۸۴ کی کل فروخت ساڑھے چودہ ارب ڈالر (۱۴٬۵۵۵٬۳۱۸٬۰۰۰ ڈالر) تھی جبکہ اس کا سالانہ منافع پونے چالیس کروڑ ڈالر تھا۔ (۳۷۶٬۴۱۴٬۰۰۰ ڈالر)

پاکستان میں موجود دواساز کثیر القومی کمپنیوں کو اس لحاظ سے اجارہ داری حاصل ہے کہ تمام قیمتی دوائیوں کے برانڈ نام ان کمپنیوں کے نام رجسٹرڈ ہیں جنہیں کوئی مقامی دواساز ادارہ تیار نہیں کر سکتا۔ ان میں اہم زندگی بچانے والی دوائیاں شامل ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام ادویات جن کی فروخت سے سپر منافع حاصل ہوتا ہے صرف یہی کمپنیاں تیار کرنے کی مجاز ہیں بالفاظ دیگر دوائیوں کی تجارت پر سے "اصل ملائی" یہ کمپنیاں اتار کر لے جاتی مقامی دواساز کمپنیاں انہیں بڑی کمپنیوں کے پھینکے ہوئے ٹکڑے اٹھا کر گذارہ کرتے پر مجبور ہیں پاکستان میں مقامی دواساز صنعت کو کوئی تحفظ نہیں دیا گیا اور کثیر القومی کمپنیوں کو مقامی منڈی کو کنٹرول میں لینے کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے۔ پاکستانی دواساز ادارے باہر سے پاؤڈر منگوا کر ان کی گولیاں بنا کر بیچ دیتے ہیں یا باہر سے مختلف قسم کے کیمیکل، ٹنکچر اور مرکبی کردم وغیرہ پیک کر کے میڈان پاکستان (MADE IN PAKISTAN) کا لیبل لگا کر فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ جن پر انہیں معمولی منافع ہوتا ہے۔ جبکہ چار ارب روپے کے کاروبار کا زیادہ تر حصہ کثیر القومی کمپنیوں کے پاس ہے اس کاروبار

میں سے ہونے والا کروڑوں روپے کا منافع یہ کمپنیاں ہر سال پاکستان سے باہر بھیج دیتی ہیں اور اس طرح سے پاکستانی معیشت کا خون نچوڑتی ہیں۔

پاکستان میں موجود کثیر القومی دواساز ادارے پاکستانی معیشت اور عوام کا کئی طریقے سے استحصال کرتے ہیں مثلاً:

(۱) یہ ادارے قریباً تمام کیمیکل اور خام مال بیرونِ ملک سے منگواتے ہیں اس مقصد کے لئے انہوں نے باہر کے ملکوں میں اپنے خرید و فروخت کے ادارے قائم کر رکھے ہیں جن سے بقول عبدالحفیظ خاں یہ ادارے عالمی منڈی کے مقابلے میں ۲۰۰ ـ ۳۰۰ فیصد سے زیادہ قیمت پر مال حاصل کرتے ہیں اور اس ہتھکنڈے سے منافع حاصل کرتے ہیں[۱۴] ان کی پاکستان میں قائم کردہ شاخوں کو خام مال آزادانہ طور پر خریدنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

(۲) ان اداروں میں ۷۵٪ کے قریب حصص غیر ملکیوں کے قبضے میں ہوتے ہیں۔ اور پاکستانی حصے دار اقلیت میں ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں تمام ترپالیسی سازی کثیر القومی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

(۳) تمام اہم عہدیداروں کو کثیر القومی کمپنیوں کا ہیڈ آفس مقرر کرتا ہے۔

(۴) یہ ادارے مختلف حیلوں بہانوں سے بے شمار منافع پاکستان سے باہر بھیجتے ہیں۔ ان میں کھاتوں میں دکھائے گئے عام منافع کے علاوہ رائلٹی، برانڈ ناموں پر لائسنس فیس، اور ٹیکنیکل فیس وغیرہ شامل ہیں۔

پاکستان سمیت تیسری دنیا کے ملکوں میں یہ دواساز کمپنیاں ایک عذاب کی طرح نازل ہوئی ہیں اور انہوں نے جو نقصان غریب عوام کو پہنچایا ہے ان میں سے کچھ کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

(الف) ان کمپنیوں نے تیسری دنیا کے غریب ملکوں کو اپنی تجربہ گاہ

بنا رکھا ہے اور یہ کمپنیاں اپنی ادویات کے اثرات کو دیکھنے کے لئے غریب ملکوں کے عوام کو استعمال کرتی ہیں۔ مقامی ڈاکٹروں اور سپیشلسٹوں کے ذریعے یہ کمپنیاں اپنا مال فروخت کرواتی ہیں۔

گذشتہ دس سال کے عرصے میں دوائیوں کی فروخت میں دس گنا اضافے کی ایک وجہ ان غیر ملکی دواساز اداروں کی غیر اخلاقی کارروائیاں بھی ہیں۔ بے شمار وسائل رکھنے کی بنا پر یہ کمپنیاں کئی "میڈیکل ریپ" مقرر کرتی ہیں اور ان کے ذریعے مقامی ڈاکٹروں کو اپنی ادویات کی فروخت میں مدد دینے پر آمادہ کرتی ہیں اس سلسلے میں مختلف ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایک نوجوان ڈاکٹر کو جس نے پریکٹس کا نیا آغاز کیا ہے دوائیوں کے مفت سیمپل، خوبصورت کیلنڈر اور سستے تحائف کے ذریعے کمپنی کی دوائیاں تجویز کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ درمیانی سطح کے ڈاکٹروں کو اچھے ہوٹلوں میں مدعو کیا جاتا ہے۔ جبکہ بڑے ڈاکٹروں، سپیشلسٹوں اور میڈیکل کالج کے پروفیسروں کو بظاہر تعلیمی و تحقیقی سرگرمیوں کے نام پر اور فی الحقیقت رشوت کے طور پر یورپ اور امریکہ کے دورے کروائے جاتے ہیں۔ یہ کمپنیاں ڈاکٹروں کی تنظیموں پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے جلسوں یا کانفرنسوں کا اعلیٰ ہوٹلوں میں بندوبست کرتی ہیں۔ تیسری دنیا کے ڈاکٹر ان کثیر القومی کمپنیوں کے سیلزمین بن کر رہ گئے ہیں۔

(ب) وہ دوائیاں جو مضر صحت ثابت ہو چکی ہیں اور ترقی یافتہ ملکوں میں ان پر پابندی لگ چکی ہے۔ لیکن ان کے سٹاک موجود ہیں ان دوائیوں کو یہ کمپنیاں مقامی افسر شاہی کو رشوت دے کر پاکستان جیسے ملکوں کی منڈی میں فروخت کر دیتی ہیں پاکستان میں اس طرح کی دوائیاں اب بھی فروخت ہو رہی ہیں جنکا استعمال عالمی مارکیٹ میں ممنوع ہے۔

(ج) پاکستان میں مقامی افسر شاہی کو چونکہ دوا ساز کمپنیاں بیش بہا رشوت دیتی ہیں اس لئے پاکستان میں دوائیوں کی فروخت پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ یہاں پر ہر قسم کی دوا بغیر ڈاکٹر کے نسخے کے ہر میڈیکل سٹور سے خریدی جا سکتی ہے۔ بلکہ دیہات اور قصبوں میں کیمسٹ جو ان دوا ساز کمپنیوں کا باقاعدہ سیلز مین ہوتا ہے خود ہی دوائیاں اور ٹیکے تجویز کرتا ہے درآں حالیکہ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں سوائے اسپرین اور پیراسٹامول کے جو درد سر کی دوائیاں ہیں کوئی دوا بھی ڈاکٹر کے نسخے کے بغیر فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ پاکستانی مریض عطائیوں، کمیسٹوں اور کمپونڈروں کی تجویز کردہ دوائیاں استعمال کرنے کے نتیجے میں نت نئی بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہیں جبکہ کثیر القومی دوا ساز کمپنیاں دوائیوں کی فروخت پر پابندی نہ ہونے کی وجہ سے کروڑوں روپے کما کر بیرون ملک بھیج رہی ہیں۔

کیڑے مار ادویات کی صنعت پر کثیر القومی کمپنیوں کا قبضہ

پاکستان میں اس وقت کیڑے مار ادویات کی فروخت کے لئے کثیر القومی کمپنیوں میں دوڑ لگی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ زراعت کے مارکیٹ کے ساتھ نتھی ہو جانے کے نتیجے میں زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے کیمیکل کے استعمال میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے گندم ہو یا کپاس، چاول ہو یا گنا، کیڑے مار ادویات کا استعمال ایک ضرورت بن گیا ہے جو کسان یہ ادویات استعمال نہیں کرتا وہ برباد ہو جاتا ہے۔ بعض فصلوں پر ان ادویات کے کئی کئی سپرے کرنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان اب کیڑے مار ادویات کی بہت بڑی مارکیٹ بن گیا ہے۔

کیڑے مار ادویات تیار کرنے کی مکمل اجارہ داری کثیر القومی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان میں ایکسون، آئی سی آئی، بائر، سینڈوز اور کئی

دیگر کمپنیاں شامل ہیں۔ کچھ کمپنیاں یہ ادویات مقامی طور پر تیار کرتی ہیں اور کچھ بیرونِ ملک سے درآمد کرتی ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کمپنیوں کے پھیلاؤ میں اضافہ ہوا ہے اور موجودہ مارشل لاء کے دور میں ان کمپنیوں کا پھیلاؤ اپنے عروج پر پہنچ گیا ہے۔

ابتداء میں جب ان ادویات کو پاکستان کی مارکیٹ میں فروخت کے لئے پیش کیا گیا تھا تو ان کی قیمتیں بہت کم رکھی گئی تھیں لیکن ہر سال ان کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

ان کمپنیوں کو پاکستان میں صرف زیادہ سے زیادہ منافع کمانے سے غرض ہے۔ منافع حاصل کرنے کی اندھی دوڑ کے نتیجے میں یہ کمپنیاں کئی منفی سماجی اثرات پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان میں بھوپال کے مقام پر وقوع پذیر ہونے والا حادثہ اس کی ایک مثال ہے۔

بین الاقوامی ادارے اوکسفیم نے اپنی ۱۹۸۲ء کی رپورٹ میں جو اس نے کرم کش ادویات اور تیسری دنیا کے عوام کی صحت کے بارے میں تیار کی ہے۔ عالمی ادارہ صحت کی ایک رپورٹ کا حوالہ دیا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ہر سال تیسری دنیا میں ۵ لاکھ افراد کرم کش ادویات کے استعمال کی وجہ سے بیمار پڑتے ہیں اور ان میں سے ۹ ہزار سے زائد مر جاتے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں (The New Internationalist) نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں سیبا گائیگی نامی کثیر القومی دواساز کمپنی کی تیار کردہ انتہائی زہریلی کرم کش دوائی گالی کرون (Gale Cron) کا ذکر ہے ۱۹۸۲ء میں اس دوائی کے زہریلے اثرات معلوم کرنے کے لئے مصری بچوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ اس دوائی سے کینسر تو پیدا نہیں ہوتا ہے۔ پہلے یہ کمپنی سوئٹزرلینڈ میں یہی دوائی تیار کرتی تھی۔ ۱۹۷۶ء میں محسوس کیا گیا کہ دوائی کی تیاری میں ضروری احتیاطی تدابیر

استعمال نہیں کی جا رہیں۔ چنانچہ اس کی پیداوار وقتی طور پر روک دی گئی دوبارہ جب نئے سرے سے پیداوار کی گئی تو انتہائی ترقی یافتہ احتیاطی نظام استعمال کیا گیا۔ مزدوروں کو خاص حفاظتی لباس مہیا کیا گیا اور یہ حفاظتی تدابیر اتنی ہی کڑی تھیں جتنی مغربی ملکوں کے ایٹمی اداروں میں ہوتی ہے۔

تاہم جب یہ انتہائی مضر کیمیکل تیسری دنیا کو سپلائی کیا گیا تو ان احتیاطی تدابیر کا کوئی خاص خیال نہ رکھا گیا۔ میکسیکو، مصر اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں اس کیمیکل کو کپاس کی فصل پر استعمال کیا گیا تاہم ان ملکوں کے مزدوروں کو چونکہ اس طرح کا لباس، دستانے اور گیس ماسک مہیا نہیں کئے گئے تھے اس لئے ان پر اس کیمیکل کے مضر اثرات بڑے پیمانے پر مرتب ہوئے۔ اس سلسلے میں سیبا گائیگی کا صرف ایک ہی جواب تھا۔ کہ اگر اس دوائی کو مناسب طریقے سے اور درست احتیاطی تدابیر کے ہمراہ استعمال کیا جائے تو یہ نقصان دہ نہیں حقیقت یہ ہے کہ جو احتیاطی تدابیر یورپ اور امریکہ میں استعمال کی جاتی ہیں (ترقی یافتہ ملک ہونے کی بنا پر) ان کا استعمال تیسری دنیا کے ملکوں میں کہیں بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ پاکستان کے دیہی علاقوں میں انتہائی مضر صحت کیڑے مار ادویات بغیر دستانے پہنے ننگے ہاتھوں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاتی ہیں۔ ان میں سے کئی دوائیاں ننگی جلد میں سے گذر کر خون میں داخل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ چونکہ کسی ماسک کا استعمال نہیں ہوتا اس لئے سپرے کرتے وقت انتہائی زہریلی گیس بعض دفعہ سانس کے ذریعے پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے اس بات کا امکان موجود ہے کہ پاکستان میں بھی کسی وقت اسی طرح کا یا اس سے بھی بدترین سانحہ وقوع پذیر ہو جائے جیسا کہ بھوپال میں ہوا تھا کپاس کی فصل میں استعمال ہونے والی زہریلی ادویات کا اثر بنولہ تک ہوتا ہے جو بعد میں گھی پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کے مضر اثرات کا کوئی مطالعہ نہیں کیا گیا۔ چونکہ غیر ملکی کثیر القومی

کمپنیوں کو صرف اپنے منافع سے غرض ہے اس لئے وہ ان تفصیلات میں نہیں جاتیں۔

یہ کمپنیاں پاکستان میں ان کیمیائی اجزاء کو دھڑا دھڑ کرم کش ادویات پیدا کرنے کے لئے استعمال کر رہی ہیں جو انسانوں اور جانوروں کی صحت کے لئے انتہائی مضر ہے اور اسی وجہ سے انکی پیداوار دنیا کے دوسرے ملکوں میں بند کی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں یہ کمپنیاں بی سی ایچ (B.C.H) ڈی۔ ڈی۔ ٹی (D.D.T) اینڈرائین (ENDRINE) ڈیلڈرائین (DIELDRIN) اور کلورین پر مبنی دیگر کرم کش ادویات تیار کرتی ہیں یہ تمام کی تمام ادویات زہریلی ہیں اور امریکہ اور یورپ میں جہاں سے یہ کمپنیاں آئیں ہیں ان ادویات کی پیداوار عرصہ دراز سے بند کی جا چکی ہے۔

کثیر القومی ہوٹل انڈسٹری

پاکستان میں ہوٹل انڈسٹری میں زیادہ تر بڑا کاروبار کثیر القومی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ عالیشان ہوٹل جنہیں فائیو سٹار ہوٹل بھی کہا جاتا ہے۔ قریباً سبھی غیر ملکیوں کے قبضہ میں ہیں، پاکستانی سرمایہ دار چھوٹے چھوٹے ہوٹل اور درمیانے درجے کے ہوٹل چلاتے ہیں۔ پانچ ستاروں والے یہ ہوٹل کراچی، لاہور اسلام آباد اور پشاور میں واقع ہیں یہ ہوٹل بھی ایوب خاں کے دور میں قائم ہونا شروع ہوئے تھے۔ اور موجودہ مارشل لا دور تک ان میں وسعت آتی رہی ہے ان میں ہوٹل انٹر کانٹینٹل کراچی، لاہور، راولپنڈی اور پشاور، ہالیڈے ان، کراچی، اسلام آباد اور ہلٹن اور شیراٹن ہوٹل شامل ہیں۔ ان میں سے ہوٹل انٹر کانٹینٹل ایوب خاں کے دورِ حکومت میں قائم کیا گیا تھا۔

ایوب خاں کے زمانے میں قائم ہونے والے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے ذریعے کثیر القومی کمپنی نے کتنا مال کمایا اس سے یہ بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دوسرے کثیر القومی ہوٹلوں کو کس قدر آمدنی ہوتی ہے۔

جب کراچی میں پہلا ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل قائم ہوا تو پاکستان سروسز لمیٹڈ کے نام کے پاکستانی ادارے نے انٹر کانٹی نینٹل کے غیر ملکی سرمایہ داروں کے ساتھ بیس سالہ معاہدہ کیا اس معاہدے کی رو سے انٹر کانٹی نینٹل کے نام استعمال کرنے والے اسوقت کے تین ہوٹلوں کے لئے جو کراچی لاہور، اور راولپنڈی میں موجود تھے۔ ان ہوٹلوں کے ہر کمرے پر ۲۵ ڈالر سالانہ کی رقم رائیلٹی کے طور پر امریکہ کی کمپنی کو دینا قرار پائی۔

اس رائیلٹی کے علاوہ یہ شرط بھی تھی کہ ہوٹلوں میں سے ہونے والے منافع کا ۲۵٪ امریکی کمپنی کو دینا پڑے گا۔ اسی طرح سے پاکستان میں کام کرنے والے ہیڈ آفس کے ملازموں کی تنخواہیں اور دیگر سہولیات کی فراہمی بھی انہی ہوٹلوں کے ذمے تھی۔ روزنامہ ڈان میں چھپنے والی ایک رپورٹ کے مطابق (۲۰ راکتوبر ۱۹۸۵) اس طریقے سے ان ہوٹلوں کے ذریعے ۲۵ کروڑ روپے کی رقم اس عرصے میں پاکستان سے باہر گئی۔

پاکستان میں کام کرنے والے دیگر کثیر القومی ہوٹل جو رقوم منافع کے طور پر ملک سے باہر بھیج رہے ہیں انہیں بھی اگر شامل کر لیا جائے تو یہ ایک بہت بڑی رقم بن جاتی ہے ...... پاکستان میں موجود دیگر کثیر القومی ہوٹل مختلف بین الاقوامی ہوٹل کمپنیوں کی ملکیت ہیں انہیں کراچی کا شیراٹن ہوٹل منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہوٹل مشہور امریکی کثیر القومی کمپنی آئی ٹی ٹی کی ملکیت ہے جو چلی میں آلندے کی حکومت کا تختہ الٹانے میں حصہ دار تھی۔

پاکستان میں کثیر القومی بنک

پاکستان میں بنکنگ کے کاروبار میں بھی کثیر القومی ادارے

داخل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت یہاں پر دو ایک برطانوی بنک موجود تھے۔ لیکن امریکی اثرات کے اضافے کے نتیجے میں ۱۹۶۰ء کی دہائی میں امریکی بنکوں نے بھی پاکستان کی مارکیٹ میں داخل ہونا شروع کیا۔ پیپلز پارٹی کی گورنمنٹ کے خاتمے کے وقت پاکستان میں کل نو غیر ملکی بنک تھے۔ جن کی ۲۹ برانچیں ملک میں کام کر رہی تھیں۔ تاہم ضیاالحق حکومت کے دوران ان بنکوں کی تعداد میں کم و بیش دوگنا اضافہ ہوا۔ ۸۳-۱۹۷۳ء تک ۱۰ سال کے عرصے میں غیر ملکی بنکوں کی تعداد ۱۷ اور ان کی برانچوں کی تعداد ۵۹ ہو گئی۔ اساسوں کی مالیت ۱۹۷۵ء میں ۲۹ ارب روپے تک پہنچ گئی۔

اس کی وجہ ضیاالحق حکومت کا امریکہ کی طرف جھکاؤ اور کثیر القومی کمپنیوں کو پاکستان میں لانے کی کوشش ہے۔

پاکستان میں کاروبار کرنے والے کثیر القومی کمپنیوں کے بنکوں میں پیش پیش برطانوی اور امریکی بنک ہیں مثلاً بنک آف امریکہ، سٹی بنک امریکن ایکسپریس چیز مین ہٹن بنک (CHASE MAN HATTAN) گرنڈلیز بنک، بعض عرب ملکوں کے بنک بھی پاکستان میں کاروبار کرتے ہیں۔ ایک بنک جس نے عرب سرمایہ اور پاکستانی انتظامیہ کے نتیجے میں خاصی ترقی کی ہے بی سی سی۔ آئی ہے۔

سالانہ منافع کے اعتبار سے ۱۹۸۵ میں یہ بنک سرفہرست تھا۔ پاکستان میں موجود غیر ملکی بنک اپنی برانچوں کے اعتبار سے پاکستانی بنکوں کا ایک فیصد سے بھی کم حصہ ہیں (پاکستانی بنکوں کی برانچیں ۱۹۸۳ء میں ۷۳۴۵ اور غیر ملکی بنکوں کی برانچیں ۵۹) تاہم ۱۹۸۳ء ہی میں ایک فیصد سے کم تعداد کے ان بنکوں میں کل جمع شدہ سرمایہ کا ۹٫۹۸ فیصد محفوظ تھا۔ اس طرح سے بنکوں کی جانب سے جاری شدہ قرضوں کا ۱۲٫۲۵ فیصد غیر ملکی بنکوں نے جاری کیا تھا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ بنک بظاہر کم تعداد کے باوجود پاکستان کی معیشت پر کس قدر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ غیر ملکی کثیر القومی بنکوں کے

۱۹۷۴ء میں بنکوں میں موجود کل جمع ہونے والا سرمایہ کا ۶ء۷ فیصد تھا جبکہ ۱۹۸۳ء میں جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے یہ تناسب ۹ء۹ فیصد ہو گیا اس طرح بنکوں کی جانب سے جاری ہونے والے قرضوں کی صورت میں کثیر القومی بنکوں کا حصہ ۱۹۷۴ء میں ۴ء۷ فیصد تھا جو ۱۹۸۳ء میں ۱۲ء۲۵ فیصد ہو گیا۔

پاکستان میں موجود کثیر القومی بنکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور کئی مزید بنک کھل رہے ہیں۔ ان کی تعداد میں اضافے سے نقصان پاکستانی بنکوں کو ہوگا ان کثیر القومی بنکوں کا پاکستان کی معیشت پر اثر بہت بڑھ جائے گا پاکستان میں موجود امریکی بنکوں میں سے دو اس وقت دنیا کے سب سے بڑے بنک ہیں؛ سٹی بنک، سٹی کارپ نیو یارک کی شاخ ہے۔ جو اثاثوں کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا بنک ہے۔ ۱۹۸۵ء میں اس بنک کے کل اثاثوں کی مالیت ایک کھرب پچاس ارب ڈالر تھی اور اس میں موجود جمع شدہ سرمایہ ۹۰ ارب ڈالر سے زیادہ تھا اسی طرح سے بنک آف امریکہ، بنک آف امریکہ کارپوریشن سان فرانسسکو کی شاخ ہے اثاثوں کے لحاظ سے یہ بنک ۱۹۸۵ء میں دنیا میں دوسرے نمبر پر تھا (کل اثاثے ایک کھرب ۱۷ ارب ڈالر سے زائد تھے) جبکہ اس میں جمع شدہ سرمایہ سٹی کارپ سے بھی زیادہ یعنی ۹۴ ارب ڈالر سے زائد تھا۔

پاکستان میں موجود کثیر القومی بنک قرضوں کے لین دین کے سلسلے میں اپنی پالیسی خود متعین کرتے ہیں جبکہ پاکستانی بنکوں کو حکومت کی جانب سے مقرر کردہ ترجیحات کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر کثیر القومی بنکوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ زراعت کے لئے قرضے دیں یا متوسط سرمایہ داروں کو قرض مہیا کریں۔ یہ بنک صرف ان شعبوں میں پیسہ لگاتے ہیں جہاں سے انہیں نہ صرف زیادہ سے زیادہ منافع حاصل ہو بلکہ جہاں سرمائے کے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ موجود نہ ہو۔ چنانچہ ان کی ترجیحات

کچھ اس طرح سے مرتب ہوتی ہیں کہ سب سے پہلے یہ بنک کثیر القومی کمپنیوں کو قرضے مہیا کرتے ہیں۔ بالخصوص ان کمپنیوں کو جنکا تعلق انکے اپنے ملک سے ہے با الفاظ دیگر یہ بنک پاکستان سے روپیہ اکٹھا کرتے ہیں اور غیر ملکی کمپنیوں کے حوالے کر دیتے ہیں اس روپے سے جو پاکستان کا ہوتا ہے غیر ملکی کمپنیاں بھی نفع حاصل کرتی ہیں اور یہ بنک بھی نفع حاصل کرتے ہیں اور پھر اس نفع کو پاکستان سے باہر منتقل کر دیتے ہیں۔ دوسری ترجیح کثیر القومی کمپنیوں اور پاکستانی سرمایہ داروں کا مشترکہ کاروبار ہے ایک اور ترجیح امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے جس سے فوری منافع حاصل ہوتا ہے اور روپے کا زیادہ دیر تک پھنسے رہنے کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا کثیر القومی بنکوں کو اس طریقے سے نقصانات کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا اور منافع کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بی۔سی۔سی آئی کی ایک شاخ بمبئی میں ۱۹۸۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ دو سال کے اندر ہی اس شاخ نے جتنا سرمایہ لگایا اس کے برابر منافع حاصل کر لیا۔ قریباً یہی حال پاکستان میں موجود کثیر القومی بنکوں کا ہے یہ بنک دو ایک سال کے اندر ہی وہ تمام رقم پوری کر لیتے ہیں جو یہ باہر سے لائے ہوتے ہیں اس کے بعد انہیں منافع ہی منافع ہوتا ہے۔

ہر کثیر القومی بنک کا ہیڈ آفس کسی ملک میں ذیلی شاخ کھولنے سے پہلے اس ملک کی صورت حال کے بارے میں ماہروں سے رپورٹ تیار کرواتا ہے جس میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ اس ملک کی معیشت اور استحکام کا کیا حال ہے۔ اس رپورٹ کی روشنی میں بنک فیصلہ کرتا ہے کہ اس ملک میں کس قدر کاروبار اور سرمایہ کاری کا "خطرہ" مول لیا جا سکتا ہے۔ یعنی دو ایک سال کے عرصے میں اپنا لگایا ہوا سرمایہ وصول کر لینے کے بعد بھی مقامی سرمائے سے بنک جو کاروبار کرتا ہے وہ اسی قدر ہوتا ہے جس قدر

ان کی نظر میں ملک کا استحکام اس کی اجازت دیتا ہے۔

پاکستان میں موجود کثیر القومی بنکوں کو یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ منافع کے طور پر حاصل ہونے والا سارا سرمایہ ملک سے باہر لے جائیں چنانچہ یہ بنک بھی ایک جونک کی طرح سے پاکستان کی معیشت کا خون چوس رہے ہیں۔

کثیر القومی کمپنیاں اور موٹر سازی سے متعلقہ صنعت

موٹر سازی کی صنعت میں کثیر القومی کمپنیاں اجارہ داری کی حامل ہیں اور مقامی سرمایہ دار کی حیثیت محض چھوٹے حصہ دار کی سی ہے۔ پاکستان بننے کے وقت یہاں پر موٹر سازی جیسی ترقی یافتہ صنعت کی کوئی بنیاد موجود نہیں تھی ملک میں تھوڑی سی موٹر گاڑیاں تھیں جو زیادہ تر برطانیہ سے درآمد کی جاتی تھیں پاکستان کے امریکی حلقہ اثر میں چلے جانے کے بعد یہاں امریکی موٹر ساز کمپنیوں کا عمل دخل بڑھنے لگا۔

۱۹۵۷ء میں جنرل موٹرز (یو کے) کو بیڈ فورڈ ٹرک اور بسیں درآمد کرنے اور مقامی طور پر پرزے تیار کر کے جوڑنے کی اجازت دی گئی۔ ایوب خاں کے برسر اقتدار آنے کے بعد ایوب خاں کے رشتے دار صنعتکار بنے تو گندھارا موٹرز والوں نے جنرل موٹرز کے ساتھ اشتراک شروع کیا اور گندھارا موٹرز جنرل موٹرز کی ذیلی شاخ قرار پائی یہ گندھارا موٹرز ایوب خاں کے بیٹے گوہر ایوب اور اس کے خسر جنرل حبیب اللہ کی ملکیت تھی۔ جنرل حبیب اللہ نے ایک دوسری امریکی کمپنی جنرل ٹائرز کے ساتھ مل کر اس کی پاکستانی شاخ جنرل ٹائرز اینڈ ربڑ کمپنی آف پاکستان ۱۹۶۳ میں قائم کی جو اب تک موجود ہے۔

۱۹۶۳ء ہی میں کثیر القومی کمپنی ہنڈا کی مقامی شاخ کی بنیاد رکھی گئی، "اٹلس آٹوز" نام کی کمپنی نے کراچی سے ہر سال ۲۳ ہزار موٹر سائیکل تیار

کرنے شروع کئے۔ دراصل یہ پرزے جوڑنے کا کارخانہ تھا۔

ایوب خاں کے دور میں اور پھر کسی قدر پیپلز پارٹی کے دور میں جاپانی موٹر سائیکل ساز ادارے اور اٹلی کی ویسپا سکوٹر ساز کمپنی نے پاکستان میں مقامی سرمایہ کے اشتراک سے کام کرنے لگے۔ موجودہ مارشل لا کے دوران ان کثیر القومی اداروں کے پاکستان میں عمل دخل میں کئی گنا زیادہ اضافہ ہو گیا۔

چنانچہ یکے بعد دیگرے مندرجہ ذیل ادارے قائم ہوئے:[۵]

	نام ادارہ	مقام و تاریخ	کل پیداوار	نام موٹر
(۱)	اٹلس آٹوز	کراچی ۱۹۶۳	۲۳،۰۰۰	ہنڈا
(۲)	داؤد یاماہا	حب چوکی	۱۰،۰۰۰	یاماہا
(۳)	سندھ انجینئرنگ	کراچی ۱۹۷۲	۱۵،۰۰۰	سوزوکی
(۴)	سیف ندیم کارپوریشن	کھلابٹ ایبٹ آباد ۱۹۸۲	۱۰،۰۰۰	کاواساکی
(۵)	خواجہ آٹوز	کراچی ۱۹۷۲	۲،۰۰۰	ویسپا
(۶)	ناولٹی انٹرپرائزز	میرپور آزاد کشمیر	۱۲،۰۰۰	ویسپا
(۷)	پنج دریا	لاہور ۱۹۸۱	۳۰،۰۰۰	ہنڈا
(۸)	رحمان سنز	گجرات ۱۹۷۷	۱۲،۰۰۰	ویسپا

مندرجہ بالا ادارے یا تو مکمل طور پر درآمد شدہ پرزے جوڑنے کا کام کرتے ہیں یا پرزوں کا اکثر حصہ درآمد کرتے ہیں اور صرف معمولی چیزیں مقامی طور پر تیار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کمپنیوں کے ذریعے پاکستان کو موٹر سازی کی صنعت میں جدید ٹیکنالوجی ٹرانسفر نہیں کی جاتی اور لیبر

کا کام ایک عام مستری سے زیادہ نہیں ہوتا ہر چند کہ بظاہر یہ انڈسٹریاں پاکستان میں موجود ہیں لیکن پاکستانی ہنرمندوں اور کاریگروں کے علم میں اضافہ کا باعث نہیں بنتیں

اس کے برعکس یہ فیکٹریاں جو لاکھوں کی تعداد میں موٹر سائیکل مقامی مارکیٹ میں فروخت کر کے اربوں روپیہ کما رہی ہیں دھڑا دھڑ منافع کی شکل میں پاکستان سے سرمایہ باہر منتقل کرتی ہیں اور اس طریقے سے پاکستان کی غربت میں اضافہ کرتی ہیں۔ پاکستان میں موجود اس وقت مندرجہ بالا آٹھ یونٹ ۱۴۰،۰۰۰ موٹر سائیکل اور سکوٹر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جبکہ کہا جاتا ہے کہ ۸۵-۱۹۸۴ میں پاکستان میں ۲ لاکھ سے زائد موٹر سائیکلوں کی مانگ تھی باقی ماندہ مانگ موٹر سائیکل اور سکوٹر درآمد کر کے پورا کیا جاتا ہے۔

اس وقت ایک موٹر سائیکل اور سکوٹر کی قیمت بالعموم پندرہ ہزار روپے سے لیکر ۲۵ ہزار روپے تک ہے۔ اگر پاکستان میں ہر سال ۲ لاکھ موٹر سائیکل بک رہے ہوں اور اوسط قیمت پندرہ ہزار روپے ہو تو انکی کل قیمت ۳ ارب روپے بنتی ہے

اس سے منافع کی رقم کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے جسکا خاصا حصہ ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔ پاکستان میں اسوقت موجود موٹر سائیکلوں اور سکوٹروں کی تعداد ۲۰ لاکھ ہے۔

یہی حال کاروں کا ہے۔ پاکستان میں ۸۴-۱۹۸۳ میں کاروں کی کل تعداد ۲۰۵،۳۶۱ (تین لاکھ اکسٹھ ہزار دو سو پانچ تھی) جبکہ پاکستان میں ہر سال کاروں کی درآمد کے اعداد و شمار مندرجہ ذیل ہیں

سال	کل تعداد
۱۹۷۴ء	۱۰,۱۶۷
۱۹۷۵ء	۳,۴۳۳
۱۹۷۶ء	—
۱۹۷۷ء	۱۱,۷۶۴
۱۹۷۸ء	۲۳,۰۷۱
۱۹۷۹ء	۲۱,۹۹۵
۱۹۸۰ء	۱۴,۲۰۴
۱۹۸۱ء	۱۹,۷۶۱
۱۹۸۲ء	۱۶,۴۵۱
۱۹۸۳ء	۲۹,۶۲۹

یہ تمام کاریں کثیر القومی کمپنیاں تیار کرتی ہیں جن میں امریکہ کی جنرل موٹرز اور فورڈ یا جاپان کی ٹیوٹا، نسان، اور اٹلی کی فیٹ، جرمنی کی مرسڈیز اور فوکس ویگن پیش پیش ہیں۔ کاروں کی امپورٹ پر پاکستان زرمبادلہ کی بہت بڑی رقم خرچ کرتا ہے پاکستان میں محض چھوٹی ضرورت کی کاریں ہی درآمد نہیں ہوتیں بلکہ ایک بڑی تعداد میں لگژری کاریں بھی درآمد کی جاتی ہیں جنہیں پاکستان کے سرمایہ دار، جاگیردار اور افسر شاہی کے بڑے بڑے ستون استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان میں استعمال میں آنے والی کچھ کاروں کی قیمتوں کے اعداد و شمار مندرجہ ذیل ہیں:

نام کار	ٹیکسوں کے بعد قیمت فروخت (پاکستانی کرنسی میں)
شراڈ (CHARADE)	۱۰۹,۰۰۰

نام کار		ٹیکسوں کے بعد قیمت فروخت (پاکستانی کرنسی میں)
شارمانٹ	(CHARMANT)	۱۶۲,۰۰۰
ٹویوٹا سٹارلٹ	(TOYOTA STARLET)	۱۱۹,۵۰۰
ٹویوٹا کرولا	(TOYOTA COROLLA)	۱۹۵,۰۰۰
ہنڈا سوک	(HONDA CIVIC)	۱۸۵,۰۰۰
ہنڈا ایکارڈ	(HONDA ACCORD)	۳۵۰,۰۰۰
ٹویوٹا کراؤن	(TOYOTA CROWN)	۷۰۰,۰۰۰
مرسڈیز بینز	(MERCEDES BENZ)	۷۰۰,۰۰۰
مرسڈیز	(MERCEDES)	۱,۴۰۰,۰۰۰

بالفاظ دیگر پاکستان میں جو درآمد شدہ کاریں زیر استعمال ہیں ان کی قیمت ایک لاکھ نو ہزار روپے سے لیکر ۱۴ لاکھ روپے تک ہے اگر اوسط قیمت ۲ لاکھ روپے تصور کی جائے اور ہر سال کاروں کی تعداد میں اضافہ کو مدنظر رکھ کر ۱۹۸۶ میں تصور کر لیا جائے کہ ساڑھے تین ہزار کاریں درآمد ہوئیں تو ۱۹۸۶ء میں کاروں پر کل خرچ ۷۰ کروڑ روپے بنتا ہے۔ اس سے ہونے والا منافع جو کثیر القومی کمپنیوں کو جاتا ہے کئی کروڑ روپے ہوگا۔

پاکستان میں گذشتہ چند سالوں کے دوران سوزوکی کار تیار کرنے کا منصوبہ شروع کیا گیا۔ اس وقت بیشتر پرزے درآمد کئے جاتے

ہیں ۔ جبکہ قلیل تعداد میں پرزے مقامی طور پر تیار ہوتے ہیں اگلے چند سالوں کے دوران رفتہ رفتہ تمام پرزے مقامی طور پر تیار کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے ۔ تاہم سوزوکی کا جو ماڈل یہاں تیار کیا جا رہا ہے وہ ہماری پورے پرزے تیار کرنے کی صلاحیت حاصل کرنے سے پہلے ہی پرانا ہو گیا ہے اور ایک نیا ماڈل مارکیٹ میں آ گیا ہے ۔

موٹر سائیکل اور کاروں کے علاوہ پاکستانی فرمیں نیز قومی صنعتی سیکٹر کثیر القومی کمپنیوں کے ساتھ مل کر ٹریکٹر سازی کے میدان میں بھی آ رہا ہے ۔ ۱۹۸۵ میں پاکستانی میں ٹریکٹروں کی کل تعداد ایک لاکھ چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی جبکہ پاکستان کی ضرورت پندرہ لاکھ ٹریکٹر ہیں ۔ اس وقت ہر سال پچیس ہزار سے تیس ہزار ٹریکٹر درآمد کئے جاتے ہیں ۸۸ ۔ ۱۹۸۷ تک درآمد کی مقدار بڑھ کر پچاس ہزار ٹریکٹر سالانہ ہو جائے گی ۔

ٹریکٹر سازی کی صنعت میں بھی ہمارا انحصار کثیر القومی کمپنیوں پر ہے ۔ اس وقت ملت ٹریکٹر برطانوی فرم میسی فرگوسن کے ساتھ اشتراک کر رہی ہے ۔ الغازی ٹریکٹر میں ٪۵۰ حصص اٹلی کی فی ایٹ کمپنی کے ہیں الائیڈ انجینئرنگ امریکی فورڈ کمپنی کے تعاون سے ٹریکٹر بنا رہی ہے ۔

موٹر سازی کے شعبہ میں گذشتہ چند سالوں کے دوران کثیر القومی کمپنیوں نے اپنے آپ کو مضبوط بنایا ہے ۔ جبکہ پاکستان میں برآمدات کے ذریعے بھی وہ کروڑوں روپے سالانہ کی آمدنی ملک سے باہر لے جا رہی ہیں ۔

خورد و نوش کی صنعت اور کثیر القومی کمپنیاں

پاکستان میں خورد و نوش کی صنعت پر بھی کثیر القومی کمپنیوں کا اثر

سال بسال بڑھتا جاتا ہے اور پاکستان سے باہر بھیجے جانے والے منافع کی رقم میں بھی بے پناہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کمپنیوں میں پیش پیش مشروبات سازی کے ادارے کوکا کولا اور پیپسی کولا ہیں جبکہ ان کے علاوہ بھی کئی دیگر کمپنیاں بسکٹ سازی، بچوں کے کھانے کی گولیاں، چاکلیٹ اور ٹافیاں بنانے میں پیش پیش ہیں۔

کوکا کولا پیپسی کولا

یہ دونوں کثیر القومی مشروبات ساز کمپنیاں پاکستان میں بمع اپنے ذیلی مشروبات کے چھوٹے چھوٹے قصبوں تک اپنا کاروبار پھیلا چکی ہیں۔ ان کے ذیلی مشروبات میں فانٹا، مرنڈا، ٹیم اور سپرائٹ شامل ہیں انہوں نے مقامی مشروبات کی صنعت پر جو اثرات ڈالے ہیں ان کا تذکرہ آئندہ آئے گا۔

سیون اپ:۔ سیون اپ پاکستان کے مقبول غیر ملکی مشروبات میں سب سے پرانا ہے اور اس کی فروخت ہر سال کروڑوں روپیوں کی ہوتی ہے سیون اپ مشہور کثیر القومی سگریٹ ساز ادارے فلپس موریس کی ملکیت ہے اس ادارے کا تذکرہ سگریٹ سازی کی صنعت کے ضمن میں اوپر آچکا ہے۔

بسکٹ ساز ادارے:۔ پاکستان میں کئی غیر ملکی بسکٹ ساز ادارے کام کر رہے ہیں جن میں پیش پیش، انگلش بسکٹ، مسٹر فوڈ اور اے۔بی بی بسکٹ ہیں۔

کثیر القومی کمپنیاں اور پاکستان کی معیشت

پاکستان میں کثیر القومی کمپنیوں کا وجود پاکستان کے عوام کیلئے کئی لحاظ سے نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ اس سلسلے میں دوا ساز کمپنیوں کا حوالہ اوپر آ

چکا ہے۔ عمومی طور پر بھی پاکستانی سماج پر ان کمپنیوں نے کئی ایک مضر اثرات مرتب کئے ہیں۔ جن میں سے کچھ کا ذکر ہم ذیل میں کریں گے۔

سامراجی کثیر القومی کمپنیوں نے پاکستان کی مقامی صنعت کو نقصان پہنچایا ہے۔ پاکستان کا مقامی صنعتکار سرمائے کے لحاظ سے ان کمپنیوں کے مقابلے میں بہت حقیر پوزیشن کا مالک ہے چنانچہ جس شعبے میں کثیر القومی کمپنیوں نے سرمایہ کاری کی ہے وہاں سے مقامی صنعتکار ختم ہو گیا ہے۔ اس کی جمع کی ہوئی پونجی ضائع ہو گئی ہے اور اسے مقابلے کی سکت نہ پاکر اپنا کاروبار بند کرنا پڑا ہے۔ غیر ملکی مشروبات کی کمپنیوں (کوکا کولا، پیپسی کولا، لائیک کولا، سیون اپ، مرنڈا، فانٹا وغیرہ) کے آنے سے پہلے پاکستان کے تمام شہروں میں سینکڑوں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے مشروبات کے کارخانے موجود تھے جن میں مقامی سرمایہ لگا ہوا تھا۔ غیر ملکی مشروبات کی کمپنیوں کے آنے کے بعد ان کارخانوں کی اکثریت تو بند ہو گئی ہے اور چند کارخانے سمٹ سمٹا کر چھوٹے شہروں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ یہاں پر بھی انہیں غیر ملکی مشروب ساز کمپنیوں کا سخت مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ کوکا کولا اور پیپسی کولا قسم کے اداروں کے پاس اتنے وسائل موجود ہیں کہ ایک طرف تو وہ کروڑوں روپے خرچ کر کے پبلسٹی کے ذریعے ٹیلی وژن، ریڈیو اور اخبارات کے وسائل سے اپنا نام چھوٹے قصبوں حتیٰ کہ دیہات تک پہنچانے کی استعداد رکھتے ہیں تو دوسری طرف وہ ان مشروبات کی تقسیم کا کام بھی پاکستان کے دور دراز علاقوں تک کر سکتے ہیں نتیجہ واضح ہے کہ مقامی سرمایہ داروں کو بالآخر چھوٹے قصبوں اور دیہات سے بھی بیدخل ہونا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ اس صنعت سے وابستہ مقامی چھوٹے سرمایہ دار کا کاروبار ٹھپ ہو رہا ہے۔ منافع کی شکل میں حاصل ہونے والا کروڑوں روپیہ کوکا کولا، پیپسی کولا، وغیرہ کمپنیاں پاکستان سے امریکہ اور دوسرے سامراجی ملکوں کو بھجوا دیتی ہیں۔

غیر ملکی مشروب ساز ادارے پاکستان سے کئی بہانوں سے روپیہ باہر بھیجتے ہیں۔ بظاہر تو یہ مشروب ساز کمپنیاں مقامی لوگوں کے اشتراک سے لگائی گئی ہیں تاہم مقامی صنعت کار کی حیثیت ایک ایجنٹ سے زیادہ نہیں ہے جسے منافع کا کمیشن حصہ ملتا ہے۔ کوکا کولا، پیپسی کولا وغیرہ کی فیکٹری تو بظاہر نواب صادق حسین قریشی یا چوہدری ظہور الٰہی نے لگائی ہوئی ہے تاہم اصل کمپنی والے ایک طرف تو کمپنی کے نام کے استعمال کی فیس وصول کرتے ہیں، مشینری اور ہر سال مہنگے ہونے والے سپئیر پارٹس کے ذریعے روپیہ ملک سے باہر لے جاتے ہیں تو دوسری طرف ان مشروبات کے خام مال کنسنٹریٹ (CONCENTRATE) کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والی رقم بھی ملک سے باہر منگوا دیتے ہیں۔

پاکستان میں کثیر القومی کمپنیاں اتنی تیزی سے پھیلی ہیں کہ ان کے ہاتھ پاکستان کے ہر شہری کی جیب تک پہنچ گئے ہیں، خواہ بچہ ہو، بوڑھا ہو، مرد ہو یا عورت ہو، شہری ہو یا دیہاتی، مشروبات ساز اداروں کے علاوہ پاکستان بھر کے بڑے شہروں میں آئس کریم بنانے والی کمپنیاں ہیں، ملبوسات بنانے والے ادارے ہیں، دواساز ادارے ہیں۔ اور اب کیڑے مار دوائیاں فروخت کرنے والی کمپنیاں بھی ہیں۔ یہ تمام ادارے پاکستان کی مقامی صنعت کے لئے جان لیوا ثابت ہوتی ہیں اور ان کے ذریعے دھڑا دھڑ اربوں روپیہ ہر سال پاکستان سے امریکہ، برطانیہ جرمنی، فرانس، اور جاپان کو جا رہا ہے۔

پاکستان کے دواساز ادارے غیر ملکی کمپنیوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے چنانچہ انہوں نے دواسازی کا کام بین الاقوامی کمپنیوں کے حوالے کر دیا ہے اور خود سامراجی ملکوں سے ادویات کا خام مال درآمد کر کے اس کی پیکنگ کرتے ہیں دواسازی کی صنعت میں یہ معمولی حیثیت کا کاروبار ہے۔

بسکٹوں اور ٹافیوں کے شعبہ میں کثیر القومی کمپنیاں اتنے زور و شور سے داخل ہوئی ہیں کہ مقامی صنعتکار کے لئے ان کا مقابلہ کرنا ناممکن نظر آ رہا ہے۔ عنقریب مقامی بسکٹ ساز ادارے یا ٹافیاں بنانے والے ادارے مشروبات کی مقامی صنعت کی طرح سے چھوٹے قصبوں اور دیہات کی جانب دھکیل دیئے جائیں گے اور بالآخر یہاں سے بھی بیدخل کر دیئے جائیں گے مقامی منڈی پر اے بی سی بسکٹ، انگلش بسکٹ، مے فیر وغیرہ کا قبضہ ہو جائے گا۔

خوراک اور مشروبات کی صنعت سے تعلق رکھنے والی کثیر القومی کمپنیاں تیسری دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح پاکستان کی مارکیٹ پر چھا گئی ہیں مقامی صنعتکار اس قابل نہیں ہوتا کہ ذرائع ابلاغ پر ان کی اشتہار بازی کا مقابلہ کر سکے۔

کثیر القومی کمپنیوں کی مصنوعات کا استعمال سماجی رتبے کا نشان بن گیا ہے۔ امیر اور غریب آدمی اشتہار بازی کے نتیجے میں انہیں استعمال کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ کچی آبادیوں اور دیہات میں جہاں پینے کے لئے صاف پانی میسر نہیں وہاں کوکا کولا، پیپسی کولا، فانٹا اور سیون اپ دستیاب ہیں اور شادی بیاہ کے علاوہ بھی عام طور پر مہمانوں کو پیش کئے جاتے ہیں۔ لسی اور دودھ جو پاکستان کے کئی علاقوں میں مقبول عام مشروب سمجھے جاتے تھے اور غریب آدمی کے لئے صحت کے لحاظ سے بھی مفید تھے، ان کا استعمال رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اور ان کی جگہ کثیر القومی کمپنیوں کے مشروبات استعمال کئے جانے لگے ہیں جو مہنگے ہونے کے علاوہ انسانی صحت کے لئے غیر مفید ہیں۔

تیسری دنیا کے کئی ملکوں میں پروٹین سے بھرپور مشروبات تیار کئے گئے لیکن کثیر القومی کمپنیوں کی اشتہار بازی کا مقابلہ نہ کر سکے برازیل دنیا میں سنگترے پیدا کرنے والے بڑے ملکوں میں سے ہے مگر وہاں

سنگترے کے جوس کی مقامی صنعت ناکام ہو گئی ہے اور ہر جگہ فانٹا
بکنا شروع ہو گیا ہے جس میں وٹامن سی بالکل نہیں ہوتی اشتہار
بازی کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کوکا کولا کمپنی کو جو فانٹا
تیار کرتی ہے ٹیکسوں میں چھوٹ دے دی گئی تھی جس نے مقامی صنعت
کو نقصان پہنچایا۔ اس طرح کی ایک مثال نسلے کمپنی کی ہے جو تیسری دنیا
میں بچوں کا دودھ فروخت کرتی ہے اس کمپنی کی اشتہار بازی کے نتیجے میں
جگہ جگہ عورتیں بچوں کو اپنا دودھ پلانے کے بجائے ٹین کا دودھ پلانے لگی ہیں ایسا
کرنا سوسائٹی میں فیشن بنتا جا رہا ہے اس کے نتیجے میں بچے کی صحت پر برے اثرات
مرتب ہوتے ہیں۔ بالخصوص جب خشک دودھ میں ایسا پانی ملایا جاتا ہے جو
صاف نہیں ہوتا۔

بڑی مچھلی کے چھوٹی مچھلی کو کھانے کے عمل کی یہی تصویر سامان آرائش
(پاوڈر کریم، ٹوتھ پیسٹ، صابن سازی وغیرہ) میں بھی نظر آتی ہے اس منڈی
پر بھی غیر ملکی کمپنیاں میکس فیکٹر، ڈیولان، سمتھ اینڈ نیفیو، اور لیور برادرز
وغیرہ قابض ہو گئیں ہیں۔ بلکہ مقامی کمپنیوں کو یہاں سے بڑی حد تک دیس نکالا
مل چکا ہے۔ تبت ٹوتھ پیسٹ، تبت کریم، تبت پاوڈر وغیرہ ان سے مقابلہ
کرنے کی اہلیت نہ رکھنے سے ایک (اور بڑا نقصان جو کثیر القومی) کمپنیوں کی وجہ
سے پاکستانی عوام کو ہو رہا ہے وہ بیکاری کا ہے۔ یہ تمام کمپنیاں اس طرح کی مشینری
کے ذریعے پیداوار کرتی ہیں جس مشینری پر سرمایہ تو زیادہ لگتا ہے اور ملک سے
باہر چلا جاتا ہے لیکن ان فیکٹریوں میں مزدوروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے
اس کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

کثیر القومی کمپنی ایگرو ایسوسی ایٹس آف ویسٹ ہارٹ فرڈ نے حال
ہی میں پاکستان میں مرغی کے انڈوں سے چوزے نکالنے کی فیکٹری لگائی ہے
جو ہر ہفتے انڈوں سے ایک لاکھ چوزے نکالنے کی استعداد رکھتی ہے اس

فیکٹری میں کوئی نصف کروڑ روپے کی مشینری لگی ہے لیکن اس میں کل ملازمین کی تعداد صرف پندرہ ہے۔ مرغیوں کی خوراک پیدا کرنے والی ایک فیکٹری میں ۴/۱ ۲ کروڑ روپے کے قریب سرمایہ کاری کی گئی ہے تاہم اس کے ملازمین کی کل تعداد چالیس ہے۔ آئی سی آئی کی پولی ایسٹر کی فیکٹری ۸۰ کروڑ روپے سے زیادہ مالیت کی ہے۔ اس فیکٹری میں زیادہ سے زیادہ ۴ سو آدمی کام کر سکتے ہیں۔ یہی حال دیگر تمام کثیر القومی کمپنیوں کی فیکٹریوں کا ہے۔ یہ کمپنیاں انتہائی مہنگی مشینری بناتی ہیں تاکہ پاکستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں اسے فروخت کر کے زیادہ سے زیادہ سرمایہ ان ملکوں سے نکال لیا جائے جبکہ یہ ایسی ٹیکنالوجی استعمال کرتی ہیں جس سے مقامی لوگوں کو کم سے کم روزگار ملتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان میں وہ مقامی فیکٹریاں جو ان کی وجہ سے بند ہوتی ہیں زیادہ سے زیادہ مزدوروں کو روزگار مہیا کرتی تھیں چنانچہ یہ کمپنیاں پاکستان سے ایک طرف تو ہر سال کروڑوں روپے باہر لے جاتی ہیں تو دوسری طرف جدید مشینری کی وجہ سے پاکستان میں بیروزگاری کو فروغ دیتی ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کثیر القومی کمپنیاں تیسری دنیا کے ملکوں میں اپنی پسماندہ ٹیکنالوجی لے کر آتی ہیں۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں چونکہ ہر وقت نئی چیزیں متعارف ہو رہی ہوتی ہیں اس لئے پرانی ٹیکنالوجی اور اس سے متعلقہ مشینری کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ کثیر القومی کمپنیوں کے لئے سردرد بن جاتا ہے۔ وہ چیزیں جو یورپ امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ملکوں کے لوگ خریدنے سے انکار کر دیتے ہیں (بہتر چیزوں کے مارکیٹ میں آ جانے کی وجہ سے) وہ پاکستان جیسے ملکوں کے سر تھوپ دی جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں موریس کار کی فیکٹری پاکستان کو فروخت کی جا رہی تھی۔ یہ وہ کار ہے جس میں استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی پرانی ہو چکی ہے اور خود برطانیہ میں جہاں یہ کار تیار ہوتی تھی اب اسے کوئی نہیں خریدتا۔ چنانچہ اس فیکٹری کو جس کا مقدر بھٹی میں ڈالا جانا تھا اُ

کوڑیوں کے مول بکتا تھا، مہنگے داموں پاکستان کو فروخت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح کی کئی اور مثالیں بھی موجود ہیں۔

اس وقت کثیر القومی کمپنیوں نے پاکستان کے ٹیلی ویژن، ریڈیو، اخبار و رسائل پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ ٹیلی وژن اور اخبارات کے چلنے کا دارومدار ایڈورٹائزمنٹ ملنے پر ہوتا ہے۔ اس وقت کپڑے مار دوائیاں فروخت کرنے والی کمپنیاں، مشروب ساز ادارے، سگریٹ بنانے والے غیر ملکی ادارے بے شمار روپیہ پبلسٹی پر خرچ کرتے ہیں۔ پاکستان کے ٹیلی وژن ریڈیو اخبارات و رسائل جو ہر سال کروڑوں روپیہ کی کمائی ان کمپنیوں کی مصنوعات کی پبلسٹی کر کے کماتے ہیں بالآخر ان کمپنیوں کے محتاج ہو جاتے ہیں اپنی اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر یہ کمپنیاں ہمارے ذرائع ابلاغ کی پالیسیوں پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ جو نشریاتی ادارے ان کمپنیوں سے کروڑوں روپے حاصل کرتے ہیں وہ ان کمپنیوں کی عوام دشمن کارروائیوں یا ان کے سامراجی آقاؤں کی مخالفت کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔

پاکستان میں ان کمپنیوں نے کچھ مقامی کھاتے پیتے لوگوں کو بھی چھوٹے حصہ دار کے طور پر اپنے ساتھ ملایا ہوا ہے۔ اسی طرح سے فوجی و سول افسر شاہی کے ریٹائرڈ افسروں یا ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو اعلیٰ تنخواہوں پر ملازم رکھا ہوا ہے ان طریقوں سے یہ کمپنیاں ہر وقت ہماری ملکی پالیسیوں پر اثرانداز ہوتی ہیں اور ہماری داخلہ و خارجہ پالیسی کو اپنے مفادات کے تابع کرتی ہیں ان کمپنیوں کو اپنا کاروبار قائم کرنے کے لئے طرح طرح کی ترغیبات دی جاتی ہیں۔ جن میں کئی سالوں کے لئے ٹیکسوں کی چھوٹ، پاکستان سے منافع لے جانے پر کسی قسم کی پابندی کی عدم موجودگی اور کئی دیگر ترغیبات شامل ہیں۔

تیسری دنیا کے کئی ملکوں نے اپنی صنعت کے تحفظ کے لئے کثیر

القومی کمپنیوں پر پابندیاں عائد کی ہیں مثلاً جنوبی کوریا میں یہ کمپنیاں اندرون ملک فروخت کے لئے مال کی پیداوار نہیں کر سکتیں اور صرف برآمد کے لئے اشیاء تیار کرتی ہیں۔ مزید یہ کہ ان کمپنیوں کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ مقامی سرمائے کے اشتراک کے بغیر کام نہ کریں

اسی طرح سے یہ کمپنیاں خاص مقدار سے زیادہ آمدنی ملک سے باہر نہیں لے جا سکتیں۔ پاکستان میں اس طرح کی کوئی شرط ان پر عائد نہیں کی گئی۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ان کمپنیوں نے مقامی چھوٹے صنعت کار کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے جو اسکے ساتھ مقابلہ نہیں کر پاتا اور یہ کمپنیاں دھڑا دھڑ بغیر پابندی کے ملک کی دولت باہر لے جا رہی ہیں ملکی خام مال کی سستے داموں خریداری نیز لیبر کا استحصال اس کے علاوہ ہے۔

ان کمپنیوں کی کارروائیوں کے پاکستانی معیشت پر دور رس اثرات مرتب ہونگے کیڑے مار دوائیوں کو ہی لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ دوائیاں مختلف چالاکیوں کے ذریعے پاکستان کی مارکیٹ میں داخل کی گئیں شروع میں ان کی قیمتیں بہت کم رکھی گئیں تاکہ لوگوں کو ان کے خریدنے پر رضا مند کیا جا سکے۔ اب حال یہ ہے کہ انکی قیمتیں متوسط کسان کی پہنچ سے بھی باہر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ان دوائیوں کے کثرتِ استعمال کی وجہ سے فصلیں تباہ کرنے والے کیڑوں کی قوت مدافعت میں بھی اضافہ ہوا ہے چنانچہ جو فصلیں پہلے ان ادویات کے بغیر پیدا کی جاتی تھیں اب انکا ان ادویات کے بغیر پیدا کرنا ممکن نہیں رہا۔ غریب کسان ان ادویات کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی قیمت ادا کرنے کے قابل نہیں چنانچہ اس کے لئے کاشتکاری کرنا ناممکن ہوتا چلا جا رہا ہے اس کے سامنے دو راستے رہ گئے ہیں اپنی زمین بڑے زمیندار کے پاس فروخت کر کے خود کھیت مزدور بن جائے یا شہروں کا رخ کرے

حال میں اکھٹے کئے گئے زرعی اعداد و شمار کے مطابق چھوٹے

کسانوں کی تعداد میں پانچ سال کے عرصہ میں کمی واقع ہوئی ہے جبکہ بڑے زمیندار
کی زرعی ملکیت میں اضافہ ہوا ہے[۱۹] ان کیڑے مار ادویات کا حال بھی دیگر ادویات
کی طرح کا سا ہے اس میدان میں مقامی سرمایہ دار موجود نہیں چنانچہ پاکستان
کی زراعت مکمل طور پر سامراجی کمپنیوں کے کنٹرول میں چلی گئی ہے اگر وہ چاہیں
تو ادویات کی سپلائی روک کر ملک میں قحط یا زراعت کی بربادی پیدا کر
سکتے ہیں۔

ایک طرف کیڑے مار ادویات کو پاکستان کی زرعی مارکیٹ میں داخل کر کے
ہمیں مجبور کر دیا گیا ہے کہ ہم انہیں زیادہ سے زیادہ مقدار میں استعمال کریں
ساتھ ہی ان کی قیمت میں ہر سال اضافہ پر اضافہ کئے جا رہے ہیں تاہم ہماری
زرعی اجناس کی قیمتوں میں مناسب اضافہ نہیں کرنے دیا جاتا۔

سامراجی کثیر القومی کمپنیوں کو پاکستان میں کھلی چھٹی اس لئے دی
گئی ہے کہ یہ کمپنیاں پاکستان کے حکمرانوں اور افسر شاہی کو روز اول سے رشوت دیتی
چلی آئی ہیں۔ ایوب خاں کے بیٹوں نے جنرل موٹرز کے اشتراک سے گندھارا انڈسٹریز
قائم کی۔ بھٹو کے زمانے میں پی آئی اے کے ہوائی جہازوں کی خریداری کے سکینڈل
میں اہم لوگ ملوث تھے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بھٹو دور میں جہاں ایک طرف کئی
مقامی سرمایہ داروں کی فیکٹریوں اور ملوں کو قومی تحویل میں لیا گیا وہاں کسی
بھی کثیر القومی کمپنی کو ہاتھ لگانے سے گریز کیا گیا۔ جبکہ موجودہ دور حکومت میں
اسلحہ کی خریداری کے دوران امریکی اسلحہ ساز کمپنیوں سے رشوت حاصل کرنے کے
سلسلے میں ائر فورس اور فوج کے اہم عہدیداروں کے نام لئے جاتے ہیں

پاکستان میں کثیر القومی کمپنیوں کے کاروبار میں اضافہ کے نتیجے میں
ہماری سیاست پر انکی گرفت بڑھتی چلی جائیگی۔ یہ بات ان کمپنیوں کے
مفاد میں ہو گی کہ پاکستان میں کوئی ترقی پسند حکومت برسر اقتدار نہ آئے

اس مقصد کی خاطر یہ کمپنیاں فوجی آمریت کا سہارا ڈھونڈیں گی دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں، اخبارات و رسائل کی بھی بھرپور مالی امداد کریں گی اور ترقی پسند جماعتوں اور کارکنوں کو غیر موثر کرنے کے لیئے سی آئی اے کو استعمال کریں گی۔

پاکستان میں کثیر القومی کمپنیوں پر کنٹرول

ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ پاکستان میں موجود کثیر القومی کمپنیوں کی کارروائیوں کو کنٹرول کیا جائے اور انکے عمل دخل کو قومی مفادات کے تابع کر دیا جائے اگر یہ نہ کیا گیا تو اس بات کا خدشہ ہے کہ یہ کمپنیاں جونکوں کی طرح ہماری قومی معیشت سے تمام خون چوس لیں گی اور پاکستان ایک دیوالیہ ملک بن جائے گا۔ پاکستان میں کانگو، چلی اور ایران کی طرح یہ کمپنیاں حکومتوں کے تختے الٹواتی رہیں گی اور ہماری ملکی سیاست کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لئے مختلف سازشی حربے استعمال کرتی رہیں گی اس سلسلے میں کم ازکم مندرجہ ذیل اقدامات عمل میں لانا ضروری ہیں۔

(۱) مقامی چھوٹے صنعتکار کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اسے ان کمپنیوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچایا جائے بالفاظ دیگر ان کمپنیوں کو وہ مصنوعات تیار کرنے کی اجازت نہ دی جائے جنہیں مقامی صنعتکار تیار کر سکتے ہیں۔

(۲) کثیر القومی کمپنیوں کے مقامی اداروں میں اکثریتی حصہ داری مقامی لوگوں کی ہو۔

(۳) ان کمپنیوں کے مقامی افسر شاہی اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ تعلقات پر پابندی لگائی جائے اور باقاعدگی سے ان کی تفتیش کرائی جائے۔

(۴) ان کمپنیوں کو اس امر کا پابند کیا جائے کہ وہ اپنی پیداواری ٹیکنالوجی پاکستان میں منتقل کریں تاکہ ہم بالآخر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔

حوالہ جات

۱۔ ماخذ: رسالہ فارچون" (Fortune) 19 اگست 1985

۲۔ "Private Power, Multinational Corporations for the Survival of Our Planet" Axel Madson, N.Y., 1980

۳۔ دیکھئے کراگانوف کا مضمون: کثیر القومی کمپنیوں کی تخریب کارانہ کارروائیاں " (انگریزی) ماہنامہ International Affairs, ماسکو اکتوبر 1976

۴۔ "Systematic Risk and Policy" Wm. R.Cline, Washington, 1984

۵ اعداد و شمار زیادہ تر World Almanac 1973 سے لئے گئے ہیں۔

۶۔ حوالہ Axel Madson مذکورہ کتاب

۷۔ حوالہ World Almanac 1973

۸۔ حوالہ Axel Madson مذکورہ بالا کتاب

۹۔ "Pakistan's Development: social goals and private incentives", Gustav F. PAPANEK, 1967

۱۰۔ لیور برادرس پاکستان لمیٹڈ " رپورٹس اینڈ اکاونٹس"، ۱۹۸۴ء

۱۱۔ پاکستان اینڈ گلف اکانومسٹ " جون ۲۱۔۱۵ ۱۹۸۵ء

۱۲۔ بابر ایاز کا مضمون " سگریٹ انڈسٹری: قومی کمپنیاں جنگ ہار رہی ہیں۔ " روزنامہ ڈان "کراچی ای پی آر اگست ۲۳۔۱۷ ۱۹۸۵ء

۱۳۔ "پاکستان اینڈ گلف اکانومسٹ" فروری ۲۲۔۱۶ ۱۹۸۵ء

۱۴۔ مذکورہ بالا حوالہ

۱۵۔ ماخذ: پاکستان اینڈ گلف اکانومسٹ ستمبر ۲۷۔۲۱۔ ۱۹۸۵

۱۶۔ ملاحظہ ہو: عمر اصغر خاں کا مضمون" روزنامہ مسلم"، اسلام آباد ۲۹ جنوری ۱۹۸۵ء

پڙهندڙ نَسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ”اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندَڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، چُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندَڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙَهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنيٰ e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌَڻُ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاريِ تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پڙهندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪـو بـہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهـڙي دعوىٰ ڪري ٿـو تـہ پَڪَ ڄاڻو تـہ اُهو ڪُـوڙو آهي. نہ ئي وري پَـنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪـو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَـنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پڙهندڙ نَسُل وارا پَـنَ بہ مختَلِف آهـن ۽ هوندا. اُهي ساڳِئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. ٻيـن لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصي ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪـار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِيـن. اهـڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَـرڻ جـي اُصـولَ هيـٺ ڏي وَٺُ ڪنـدا ۽ غيرتجـارتي non-commercial رهنـدا. پَنَـن پـاران ڪتـابن ڪـي ڊِجيِٽـائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مـالي فائدو يا نفعو حاصل ڪـرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن ڪي ڊِجيِٽائِيز ڪرڻ ڪان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪـو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ پلي ڪمائي، رُڳو پَنَـن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پڄاندڙ وڏِ کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلمَ حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ باروڊَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄ ڪلهہ نيلا پيلا آهن؛

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَمَ- گولو،

جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اڄڪلهہ ڄاڻائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَڙهڻ جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۾ سماجي حالتن تان نظر کڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اٽڃاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَڻَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بڻائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، چالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽتر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻَ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)